Journey of Ahlebait and their Shias in the early History of Islam

ابتدائی تاریخ اسلام میں اہل بیت اور شیعان علی ابن ابی طالب کا سفر

محمّد عامر حسینی

9/28/2021Tuesday, September 28, 2021

میں طبقات الکبیر جس کا نگران ابن سعد زھری ہے کی تاریخ کی سرنگ سے یہ سفر کررہا تھا۔ تاریخ کی اس سرنگ سے بنوہاشم کے محلے میں، میں جب علی ابن ابي طالب کی مکان کے سامنے پہنچا تھا تو مجھےاس سرنگ کے نگران نے بتایا کہ جانے والے کی عمر 58 سال تھی۔ اس سے مجھے تاریخ کی اس سرنگ میں مزید سفر کرنا تھا اور سفر کرکے 38 هجری کے شعبان کے مہینے میں شہر کوفہ پہنچنا تھا۔

شعیان آل محمؐد کی تاریخ پہ چند مباحث

اس مقالے میں پہلی صدی ھجری کے شیعان آل محمؐد کی تاریخ کے آغاز اور نشونما کا ابتدائی عرب روایت کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں شیعان آل محمؐد کے کردار کو جھوٹ، تہمت اور بہتان سے پاک کرنے کے لیے ہمیں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اولین شیعان آل محمؐد جن کی اکثریت کا تعلق کوفہ سے تھا کے بارے میں صرف اموی پرست، ناصبیوں کے اندر یہ خیال راسخ نہیں ہے کہ وہ امام علی علیہ السلام سمیت آل محمؐد سے غداری، بے وفائی اور دھوکے کے مرتکب ہوئے بلکہ یہ خیال خود آج کے امامی و اسماعیلی و سنّی شیعان آل محمؐد کی اکثریت میں بھی راسخ ہے۔ اگرچہ امامی و اسماعیلی شیعہ کی اکثریت ان کو "کوفی" کہہ کر غداری کا طعنہ دیتی ہے اور انہوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ کوفہ میں مخلص شیعان آل محمؐد چند ہی تھے جبکہ سنّی شیعان آل محمؐد کے ہاں جو اکثریت ایسے اہل علم کی ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ آل محمؐد کے حمایتی تھے جنھوں نے امام علی ، امام حسن اور امام حسین علیھم السلام کو دھوکا دیا اور ان کے ہاں آل محمؐد کے مخلص پیرو کوفہ

میں چند لوگ ہی تھے۔ دیکھا جائے تو ایک یا دوسرے طریقے سے امامی و اسماعیلی و سنّی شیعان آل محمؐد ایک سا خیال رکھتے ہیں۔ ایسے اہل علم جن کو ہم ایسے سنّی کہہ سکتے ہیں جن کے ہاں شامی، امویوں کے لیے گوشہ ہمدردی ہے وہ امام حسن اور امام حسین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی ذمہ داری کوفی شیعان آل محمؐد پر ڈال دیتے ہیں اور وہ ان کو اندر سے زندیق اور اسلام کے دشمن ثابت کرنے پہ زور لگاتے ہیں اور یہ لوگ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ملوکیت کی حمایت کے ساتھ ساتھ ناصبیت جدیدہ کے معمار بھی ہیں۔ پاکستان میں امامی شیعان آل محمؐد کی صفوں میں اب جواد نقوی جیسے لوگ بھی آگئے ہیں جنھوں نے اب اعلانیہ یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قتل کے ذمہ دار کوفہ کے شیعان ہیں۔ اور یہ اپنے دعوے کے حق میں ایسی روایات پہ اعتماد کرتے دکھائی دیتے ہیں جو گروہ شامی کی گھڑی ہوئی ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جواد نقوی جیسے لوگ کسی نادانی کے سبب یا بنا بر خلوص اپنی معروضی تحقیق کو پیش کرنے والوں میں سے نہیں ہیں بلکہ اس کے پیچھے مذموم مقاصد ہیں اور عارضی معاشی و سیاسی مفادات ہیں۔ میرا اس بات پہ یقین رہا ہے کہ شیعان آل محمؐد کی معروضی اور حقائق پہ مبنی تاریخ کو اگر سامنے لانا ہے تو اس کے لیے ہمیں جذباتیت اور مناظرانہ ڈسکورس پہ مبنی بیانیوں سے

گریز کرتے ہوئے اسلام کی ابتدائی تاریخ پہ سنجیدہ مباحث کو فروغ دینا ہوگا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علی ابن ابی طالب خلیفہ راشد بنے تو اس وقت مدینہ،کوفہ،بصرہ اور دمشق یہ چار مراکز تھے اور ہم نے یہ دیکھا کہ جومہاجراور انصار صحابہ کرام تھے ان کی اکثریت حجاز اور عراق میں موجود تھی۔ ان میں ایک گروہ تو ایسا تھا جو پہلے دن سے اسے "فتنہ عظیم" قرار دے کر الگ ہوگئے۔ مدینہ میں عبداللہ بن عمر ، سعد بن ابی وقاض جیسے صحابہ کرام نمایاں تھے۔ دوسرا گروہ مہاجرین و انصار صحابہ کرام کا وہ تھا جس نے حضرت علی کے ہاتھ پہ بیعت کی مگر وہ مدینہ سے مکّہ روانہ ہوا اور وہاں سے باہم مشورہ ہوکر وہ بصرہ چلے گئے اور انہوں نے امام علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بیعت کو توڑ دیا اور خون عثمان کا قصاص کا مطالبہ بلند کیا اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ اس گروہ کی قیادت ام المومنین عائشہ صدیقہ ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر کررہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس گروہ میں بنوامیہ کے لوگوں کی بھی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ یہ دوسرا گروہ جومکّہ و مدینہ سے نکلے تھے ان کے پیچھے مدینہ اور

مکّہ میں جو مہاجرین و انصار رہ گئے تھے ان کی اکثریت امام علی ابن ابی طالب کی بیعت پہ قائم رہی اور جو لوگ بیعت نہ ہوئے تھے وہ بھی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خلاف کسی قیام کے حق میں نہیں تھی اور الگ تھلگ پرامن زندگی گزارنے لگے تھے اور اسی لیے امام علی ابن ابی طالب نے ان سے کوئی تعارض نہ کیا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اہل مدینہ و مکّہ کی اکثریت امام علی علیہ السلام کے حجاز سے باہر جاکر بصرہ میں ناکثین بیعت سے اور شام میں منکرین بیعت سے سامنا کرنے کے حق میں نہیں تھی- یہی وجہ ہے کہ جب آپ مدینہ سے روانہ ہوئے اور آپ کا ارادہ بصرہ جانے کا تھا تو آپ کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ کا لشکر نہ تھا اور اس میں بھی ایک حصّہ کوفہ و بصرہ سے آپ کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا تھا جن میں سب سے نمایاں مالک الاشتر اور حجر بن عدی تھے۔ گویا اہل حجاز میں سے انتہائی کم لوگ آپ کے ساتھ چلے۔اور جتنے متون ہیں تاریخ کے وہ سب کے سب اس بات پہ متفق ہیں کہ مقام ذی قار پہ آپ کے ساتھ بصرہ اور کوفہ سے بڑی تعداد میں لوگ آکر شامل ہوئے اور آپ کے لشکر کی تعداد تب کہیں جاکر 20 ہزار ہوئی۔ خیر یہ سب باتیں میں اپنی کتاب کوفہ میں تفصیل سے ذکر کرچکا ہوں۔

اہل عراق کے شیعان آل محمؐد کی وفا کے بارے میں جتنے شواہد ابتدائی تاریخی متون میں موجود ہیں۔ ان کو پیش کرتے ہی آپ کے سامنے جو اعتراض شدومد سے ناصبی، اموی پرست سنّی اور یہاں تک کہ جواد نقوی جیسے شیعہ حضرات کی جانب سے سامنے آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ ان روایات کو پیش کرنے والا ثقہ نہیں ہے۔ میں نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں شیعان آل محمؐد کے علماء اور مصنفین کو عام طور پہ اس اعتراض کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ قتل عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے بعد سے شروع ہونے والی تاریخ کو مجموعی طور پہ خود بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور یہیں سے اموی اور ناصبی شیر ہوجاتے ہیں اور وہ خود کو جرح و تعدیل کے میدان کا شہسوار سمجھتے ہیں۔ اور ناصبیت و امیہ پرستوں کے اس حملے کے جواب میں سب سے پہلے ہتھیار ہمارے سنّی شیعان آل محمؐد کا ایک بڑا طبقہ گراتا ہے اور وہ شعوری ولاشعوری طور پہ اپنی سنّی شناخت کو حجاز، کوفہ، بصرہ کے اس گروہ مہاجر و انصار صحابہ اور ان کے شاگردوں سے جوڑنے لگتا ہے جو اس سارے عہد کو فتنہ عظیم کہہ کر سکوت کا ڈسکورس اپناتے تھے اور تاریخ کے اس دور کو لیکر ابتدائی اسلامی تاریخ کو ہی قول سے نہ سہی عمل سے رد کرتے تھے۔ اس روش سے سب سے بڑا نقصان شیعان آل

محمدؐ کو ہی پہنچتا ہے اور ان کے بارے میں اموی اور ناصبیوں کا پھیلایا ہوا بیانیہ ہی طاقتور اور غالب بیانیہ بن جاتا ہے۔

پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ایسے سنّی شعیان آل محمدؐ اہل علم جنھوں نے امیہ پرست اور ناصبیت کے خلاف اعلانیہ قلم اٹھایا۔ تقاریر کیں اور اس معاملے پہ خاموشی و سکوت کے موقف کو رد کردیا اور کررہے ہیں ان کے بارے میں ایک طرف تو امیہ پرست اور ناصبیوں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کیا کہ وہ اہلسنت سے نہیں ہیں تو دوسری جانب غیر امیہ پرست اور غیر ناصبی سنّی قدامت پرست علماء اور مفتیان کرام کی ایک بڑی تعداد نے ان پہ مائل بہ امامی تشیع ہونے کا الزام عائد کیا۔ پاکستان میں ہم ڈاکٹر طاہر القادری(صوفی اہلسنت)،مولانا اسحاق(اہلحدیث اہل سنت)اور علی انجنئیر(اہلحدیث سنّی عالم) اور مولانا طارق جمیل(دیوبندی سنّی) کے بارے میں ان کے مسالک کی جو ملاں اسٹبلشمنٹ ہے کا رویہ عمومی طور پہ مخاصمانہ پاتے ہیں اور وہ ایک یا دوسرے بہانے سے ان کی سنیت پہ اعتراض اٹھاتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دور خلافت علی المرتضی سے لیکر بعد تک آل امیہ و آل عباس کی سرکاری و درباری تشریح تاریخ کو ماننے سے انکار کردیا ہے۔ لیکن یہ سب لوگ حدیث کے

منہج سے تو اپنے ماننے والوں کی ذہن سازی کرتے ہیں لیکن تاریخ کے منہج پہ بطور خاص شیعان آل محمدؐ کے کردار کو لیکر نہیں آتے اور اس موضوع پہ ان کے ہاں کام بھی نظر نہیں آرہا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ان کی سعی اور کاوش سے اہل سنت کے مین سٹریم ذیلی مسالک میں ناصبیت اور امیہ پرستی کو سخت چیلنج کا سامن ہے اور سنّی نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مائل بہ ناصبیت اور امیہ پرست ہونے سے بچی رہی ہے۔
ایسے ہی حدیث کے منہج سے مولانا ظہور فیضی کا تصنیفی کام اہلسنت میں بہت قدر ہی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

لیکن میرے نزدیک اسلام کی ابتدائی تاریخ کے فکری رجحانات اور سماجی و سیاسی صف بندیوں میں جو شیعان آل محمدؐ کی سماجی- سیاسی تحریک اور صف بندی ہے اس پہ علمی کام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور شیعان آل محمدؐ کے کردار کا جو تاریخی استناد ہے اسے بھی شفاف طریقے سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔"کوفہ:فوجی چھاؤنی سے سماجی-سیاسی تحریکوں کا مرکز بننے تک" کتاب اسی راستے کی طرف میرے سفر کی پہلی منزل ہے۔ اس کتاب میں،میں نے شیعان آل محمدؐ بارے جو مواد پیش کیا ہے اس کی بنیاد ابومخنف، نصر بن مزاحم کے کوفہ بارے اخبار پر ہے۔ لیکن میں نے

ان دونوں حضرات کے تاریخ میں مقام ومرتبہ پہ اور استناد پہ اشارے دیے ہیں لیکن خالص نظری مقدمہ پیش نہیں کیا۔ یہ نظری مقدمہ ایک الگ کتاب کا تقاضہ کرتا ہے جس کی طرف یہ مقالہ پہلی پیش رفت ہے۔ اس مقالے کی بنیاد ایک طرف تو ڈنمارک کے مستشرق ایلرنگ لڈوگ پیٹرسن کی کتاب"علی و معاویہ ابتدائی عرب روایت میں:اسلامی تاریخ کی تدوین کا آغاز اور ارتقا" پر ہے۔ اور ساتھ ساتھ شیعان آل محمدؐ کے بارے میں ابتدائی اسلام کی تاریخ کے بنیادی متون میں موجود شواہد پہ ہے۔ میں اپنے اس مقالے میں جہاں ابتدا پہ شیعان آل محمدؐ کی تاریخ کے ماخذ کے مستند ہونے بارے ہونے والی نظری تحقیق کا خلاصہ پیش کروں گا اور ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں گا امام علی علیہ السلام نے جیسے قتل عثمان ابن عفان "فتنہ عظیم" کی علت کا سہارا لیکر خاموش بیٹھ جانے والوں سے اختلاف کیا اور ان کی انفعالیت اسلام کے منافی ٹھہرایا، ایسے ہی انھوں نے ناکثین، خوارج اور منحرفین بیعت کے مدمقابل آنے اور ان سے مصالحت و سمجھوتا نہ کرنے کی بنیاد جن افکار پہ رکھی اس سیاسی فکری نہج کو امام علی علیہ السلام کے انتہائی قریبی ساتھیوں اور ان کے مخالفین نے بھی "دین علی" کی اصطلاح میں بیان کیا۔ جبکہ آل امیہ نے شیعان علی /آل محمدؐ کے ایک سیکشن کو ترابیہ سبائیہ کا نام بھی دیا اور سب سے پہلے یہ نام ابوزر،عمار یاسر، مالک الاشتر، حجر ابن عدی جیسے کبار شیعان آل محمدؐ کو دیا

گیا اور دینے والے سب سے پہلے شخص معاویہ ابن ابی سفیان تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان کے بارے میں جو ابتدائی عرب روایت اور اس کا آغاز اور ارتقا کے اس کا منہج جو سامنے آتا ہے وہ سارے کا سارا یہ زور لگاتا ہے کہ وہ اسلامی اقدار اور اصولوں کے منافی تھا۔ دولت امیہ دور کے جو امیہ پرست اور ناصبی تھے وہ اس دین علی اور ترابیہ سبائیہ روایت کو خود امام علی و دیگر آئمہ اہل بیت سے منسوب کرنے سے شرماتے نہیں تھے لیکن جدید دور کے امیہ پرست اور جدید ناصبیوں کی اکثریت اس کی نسبت امام علی اور آل محمؐد سے نہیں جوڑتے اور اسے مجوسی، یہودی، نصرانی اور عجمی سازش قرار دیکر سارا الزام کوفہ کے شیعان آل محمؐد پہ ڈال دیتے ہیں اور وہ ابومخنف جیسے عراقی مبادی مورخین کو بھی اس سازش میں شریک بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں کوفہ کے شعیان علی اسلام کے پاک شفاف سرچشمہ علم کو گدلا کرنے والے اور ان میں گھڑے ہوئے افسانوں کی آمیزش کرکے انہیں اہل بیت کے نام سے پھیلایا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جسے اول اول نوآبادیاتی دور میں گھڑا گیا اور پھر مابعد نوآبادیاتی دور میں اسے اسلامی معاشروں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ بناکر پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ ہمیں اقبال بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسے اسلام کی عجمی تعبیر کا نام دے دیا گیا۔ اس میں تصوف اور شیعیت دونوں خاص نشانہ بنائے گئے۔

دین،تصوف، تمدن شریعت تمام
بتان عجم کے پجاری تمام
یہ امت روایات میں کھوگئی
حقیقت خرافات میں کھوگئی

ہمارے ہاں مسلم عقلیت پسندی اور روشن خیالی کے نام پہ ردتشکیل تاریخ کا رویہ نوآبادیاتی دور میں روشن خیال مسلم ریفارمسٹ دانشوروں کے ہاں ظاہر ہونا شروع ہوا اور ابتدائی اسلامی تاریخ میں مسلمانوں میں پہلی صدی ہجری میں 36 ھجری سے جو خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اس دور کے تاریخی مواد میں بالخصوص جو ابتدائی کوفی مورخین کا جو ڈسکورس تھا اس کی ردتشکیل کا رجحان طاقتور ہونا شروع ہوگیا۔ حیرت انگیز طور پہ سرسید سے لیکر پرویز تک جو عقلیت پسندانہ ہندوستانی مسلم دانشوروں کی ذہنیت ہے وہ کوفی شیعت اور تصوف کی تاریخی بنیادوں کو مشترکہ طور پہ گرانے پہ مصر ہوئی اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کی ساری تاریخ کو عمجی سازش ٹھہرادیا۔

نوآبادیاتی دور میں مسلم عقلیت پسند روایت کے خلاف دارالعلوم دیوبند ، جامعہ ملیہ دہلی ، انجمن حمایت اسلام لاہور وغیرہ سے جو مذہبی قدامت پرست اصلاح پرست روایت کے تحت جو دانشورانہ روایت ابھری اس میں فرقہ پرستانہ تاریخ پسندی کا جو رجحان سامنے آیا اس میں آل امیہ تاریخ پسندی کا رجحان بہت نمایاں تھا اور اس رجحان میں ایک اور اثر بھی شامل تھا جسے ہم ترک عثمان سلطنت کے آخری دور کا سرکاری تاریخ نویسی کا رجحان بھی کہہ سکتے ہیں۔ ترک عثمان دور میں اناطولیہ اور ایرانی صفوی شیعیت کے زیر اثر جو اینٹی عثمان رجحان تھا کے خلاف ردعمل کے طور پہ متاخر سرکاری نام نہاد سنیت پرست تاریخ نویسی کا اثر بھی تھا جس میں ابتدائی عراقی تاریخی نویسانہ رجحان کی مخالفت اور شامی تاریخی نویسی کے رجحان کی طرف جھکاؤ واضح تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی معمار مولانا یعقوب، مولانا مملوک علی، مولانا قاسم ناناتوی، مولانا محمود حسن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد انبٹھوی، مولانا حسین احمد مدنی،مولانا سعید احمد دہلوی یہ سب کے سب ایک طرف تو ترک عثمان سلطنت کے آخری دور کی اسلام کی ابتدائی دور کی ازسرنو تاریخ نویسی امیہ پرست رجحان، اینٹی کوفی تاریخ نویسی کے زیراثر تھے تو ساتھ ساتھ مغلیہ دور کے آخری فرمانروا اورنگ زیب عالمگیر کی اینٹی وحدت الوجودی تصوف و شیعت رجحان کے ساتھ ساتھ مغلیہ سلطنت کے

زوال کے بعد ریاست اودھ کی امامی شیعیت کے ماننے والے نوابوں کے زیر سایہ پیدا ہونے والے فرقہ پرستانہ رجحان پہ مبنی تاریخ نویسی کے اثرات بھی ان پر تھے جس کے سبب دارالعلوم دیوبند کے زیر سایہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے خاص طور پہ 36 ھجری سے لیکر آل امیہ کی حکمرانی تک کے بارے میں جو تاریخ نویسی کا رجحان ابھرا اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خلافت سے لڑنے والوں کے کیمپ کی طرف معذرت خواہانہ رجحان طاقتور تھا اور اس کے ذیل ہی میں دوسرا اقلیتی رجحان اعلانیہ مائل پہ ناصبیت تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے زیر سایہ غالب طاقتور تاریخ نویسی کا رجحان ہو یا اقلیتی ناصبی مائل رجحان ہو ان دونوں کے ہاں عراقی شیعان آل محمؐد کی تاریخ کو سرے سے رد کرنے کا رجحان مشترک تھا۔ اس نے نوآبادیاتی ہندوستان میں صوفی سنّیوں کے ہاں جو کوفی شیعان آل محمؐد کی تاریخ کی طرف جھکاؤ کا رجحان تھا اسے بھی بدعتی رجحان کہہ کر رد کردیا – اسے من گھڑت قصّے کہانیوں پہ مشتمل قرار دیا گیا۔ یہ رجحان واقعہ کربلا کی ذمہ داری کوفی شیعان آل محمؐد پہ ڈالتے تھےاور دیوبند کے زیراثر پہلی صدی ھجری کی تاریخ نویسی میں شامی سیاست کے لیے معذرت خواہانہ رجحان نے ترقی کرنا شروع کی۔ یہ رجحان سیاست امیر شام کے دفاع سے ترقی کرتی ہوئی سیاست یزید کے دفاع تک جاپہنچی۔ شامی ملوکیت نے جس طرح سے اسلامی اقدار و شعائر سے انحراف کیا تھا یہ اس کے انکار سے

شروع ہوتی ہوئی یزید کے کفر، فسق اور فجور سے انکار کرتے ہوئے اس کے ایک اچھے مسلمان ہونے کے دعوے تک آن پہنچی۔ آج یہ اس سے بھی ایک قدم آگے آچکی ہے۔ اب دیوبند کے ہی زیر اثر تاریخ نویسی کا ایک اور رجحان طاقتور ہورہا ہے جس کے تحت مروان اور حجاج بن یوسف بھی محترم و مکرم ٹھہرائے جارہے ہیں۔ کراچی سے حجاج بن یوسف اور مروان کو زبردست اسلامی رہنما ثابت کرنے والی دو ضخیم کتابیں شایع ہوچکی ہیں۔

دیوبند کے زیر اثر تاریخی نویسی کا یہ رجحان نوآبادیاتی دور ہی میں براہ راست واقعہ کربلا سے جڑی محرم کی ثقافت پہ براہ راست حملہ آور ہوا۔ ایک ایسی ثقافت جو ہندوستان میں صدیوں کے ارتقائی سفر سے گزرتی ہوئی کمپوزٹ کلچر کا حصّہ بنی اسے اسی تاریخ نویسی کے زیراثر صرف شیعہ امامی مسلمانوں کی غیراسلامی بدعتی ثقافت کہنے پہ اصرار شروع ہوا۔

جہاں عقیدت پرست صوفی سنّی اسلام کے خلاف دارالعلوم دیوبند کے زیراثر اصلاح پرست تحریک نے سفر شروع کیا تو ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند مدرسہ تحریک نے سنّی مسلمانوں کو محرم کی ثقافت، شعائر اور رسوم و رواج سے الگ کرنے کی تحریک بھی

شروع کی۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنی سوانح عمری "نقش حیات" میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ سنّی مسلمانوں کے ہاں محرم میں تعزیہ داری، نیاز و ختم، امام حسین کا فقیر بننا، محرم الحرام سے نو ربیع الاول تک شادی بیاہ، عقیقہ جیسی رسومات سے گریز کرنا عام تھا۔ یہاں تک کہ حسین احمد مدنی کہتے ہیں کہ دیوبند شہر میں سنّی مسلمانوں کی مساجد سے دس محرم کو تعزیے کے درجنوں جلوس اور خود حسین احمد مدنی کے رشتہ دار خواتین کے ہاں مجالس واقعہ کربلا کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ پانی و شربت کی سبیلیں لگا کرتیں اور نیاز امام حسین کے چاول، حلیم و حلوہ تیار کیا جاتا تھا۔ حسین احمد مدنی کہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے سنّی مسلمانوں میں رائج ان شیعہ بدعات کو ختم کرنے کے لیے خصوصی اصلاحی تحریک چلائی اور اودھ سے اس کا سلسلہ ہندوستان کے دیگر علاقوں تک پھیلایا۔

محرم کی ثقافت سے سنّی مسلمانوں کو الگ کرنے سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ بعد ازاں اس ثقافت کو ہی مٹانے کی کوشش تک آیا اور اصلاحی کوششوں نے نوآبادیاتی دور میں ہی فرقہ وارانہ تشدد اور فساد کی شکل اختیار کرلی۔ سب سے پہلے اس کی لپیٹ میں لکھنؤ آیا، پھر مظفر نگر اور پھر بہار اور اس کے بعد پنجاب اس

کی لپیٹ میں آیا۔ مشیر الحسن نے اس موضوع پہ ایک پورا مقالہ تصنیف کیا جو میری کتاب "شیعہ نسل کشی: افواہ یا حقیقت" میں شامل ہے۔ مشیر الحسن اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ دارالعلوم دیوبند، جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار جیسی جماعتیں تھیں جنھوں نے محرم کی مشترکہ ثقافت اور مشترکہ مسلم تیوہار کہلانے والے محرم کو غیراسلامی شیعہ امامی تیوہار بنانے پہ اصرار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس دعوے کی نفی صوفی سنّی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے کی اور علمائے فرنگی محل میں اس میں سب سے آگے تھے۔

پاکستان میں سنّی تاریخ نویسی کو امیہ پرستانہ تاریخ نویسی بنانے کی روایت دارالعلوم دیوبند کے زیراثر جڑ پکڑنی شروع ہوئی۔ نصاب تعلیم میں ابتدائی مسلم تاریخ اور اسلامیات و اردو کی کتابوں میں واقعہ کربلا حاشیے پر لیجاتے لیجاتے اس کا زکر پرائمری، مڈل، ہائی اور اسکینڈری جماعتوں کی نصابی کتابوں سے غائب کردیا گیا۔اور اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ پنجاب اسمبلی نے ایک قانون بنانے کی کوشش کی جس کے مطابق اہل بیت اطہار کے ناموں کے ساتھ علیہ السلام نصابی و غیر نصابی کتب میں لکھنا قابل دست اندازی جرم قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ اور پاکستان میں تحریری،

تقریری اور سوشل میڈیائی سطح پہ 36 ھجری سے لیکر 61ھجری تک کے کئی ایک واقعات کا بیان بھی گستاخی و توہین کے زمرے میں آنے لگا ہے اور ان واقعات کو نقل کرنے پہ پاکستان الیکٹرانک و سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت سینکڑوں ایف آئی آرز کا اندراج ہوا اور یہاں تک کہ 295 اور 295 اے کے تحت بلاسفیمی قرار دے کر مقدمات کا اندراج کیا گیا ہے۔

پاکستان میں امیہ پرست تاریخی نظریات کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پہ مقدس قرار دے کر محرم کی ثقافت اور محرم کا تیوہار "شیعہ امامی" تیوہار بن چکا ہے اور ریاستی سطح پہ پابندیوں نے سنّی مسلمانوں کی اس تیوہار میں ثقافتی شرکت کو نہ ہونے کے برابر بنادیا گیا ہے۔ نوے کی دہائی سے محرم کے جلوسوں اور مجالس عزا پہ دہشت گردانہ حملوں نے محرم روٹس کے حفاظتی انتظامات کے نام پر اٹھائے گئے اقدامات اور محرم کے ضابطہ اخلاق کے تحت عائد کی گئی پابندیوں نے محرم کے تیوہار سے پاکستان میں سنّی اکثریت اور دیگر مذاہب کے لوگوں کی شرکت کو بہت زیادہ کم کردیا گیا ہے۔
پاکستان میں سنّی تعزیہ کے جلوسوں، سبیلوں، نیاز کی روایت محرم روٹس پہ دھیرے دھیرے مر رہی ہے۔ محرم روٹس کی حفاظت کے لیے اور امام بارگاہوں کی حفاظت کے لیے اٹھائے گئے اقدامات جو

دہشت گردی اور تکفیری عناصر کے متشدد اعمال کا نتیجہ ہیں ان کو لیکر پاکستان میں ایک لبرل۔سیکولر سیکشن بھی عوام کی مشکلات ختم کرنے اور راستے کھلے رکھنے کے نام پر محرم کے جلوسوں کو امام بارگاہوں تک محدود کرنے کی مانگ کرتا نظرآتا ہے۔

پاکستان میں امیہ پرست اور ناصبی تاریخ نویسی کے رجحان نے امامی شیعہ کی نسل کشی کو ایک امر واقعہ بنایا اور واقعہ کربلا سے جڑی فکر و نظر سے وابستگی کو جرم بنادیا ہے۔

پاکستان کی جامعات میں ابتدائی اسلام کی تاریخ پہ آزادانہ تحقیق پہ مبنی دانشورانہ کام کو سنجیدہ تاریخی ریسرچ کے زمرے میں خیال نہیں کیا جاتا۔ اور اسے فرقہ وارانہ خیال کیا جاتا ہے۔ خاص طور پہ پہلی صدی ھجری کے شیعان آل محمؐد کے معروضی تاریخی کردار پہ تحقیق تو غیراعلانیہ پابندی کا شکار ہے۔ اور ایک کمپوزٹ اسلامی کلچر کی تحقیق پہ اصرار کسی جامعہ کے محقق کے قتل کا سبب بھی بن سکتا ہے جیسے کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر شکیل اوج اور ماس کمیونیکشن کے استاد یاسر وحید کا قتل تھا۔

امیہ پرست تاریخ نویسی کا جبر اس کے الٹ تحقیق کو مشکل ہی نہیں بناتا بلکہ بہت سے خطرات کو دعوت دینے کے مترادف بھی ہے۔ ایسے سنّی پس منظر کے دانشور جو ابتدائی تاریخ اسلام میں شیعان آل محمؐد کی تاریخ اور اس کے سنّی شیعان آل محمؐد اور امامی شیعان آل محمؐد ایک ہی سماجی- سیاسی کیمپ کا حصّہ ہونے پہ تحقیق کرتے ہیں اور اور اسے اسلامی تاریخ کی مستند روایت کے طور پہ پیش کرتے ہیں وہ سماجی بے گانگی کا زبردست شکار ہوتے ہیں اور ان کی سنّی شناخت بھی غیر معتبر ٹھہر جاتی ہے۔ میں نے خود ذاتی سطح پہ اس کا تجربہ کیا ہے اور کررہا ہوں حالانکہ میرے اردگرد رہنے والے میرے خاندان کے سنّی پس منظر سے بھی واقف ہیں اور میرے مارکس وادی نظریات و رجحانات اور مارکس واد نظریات کے تلے دور طالب علمی سے میری بھرپور عملی سیاسی سرگرمیوں سے بھی واقف ہیں۔ اس کے باوجود اسلام کی ابتدائی سماجی- سیاسی تاریخ پر میرے تحقیقی کام کو دیکھ کر یہ سوال ضرور کیا جاتا ہے کہ کیا میں "شیعہ" ہوچکا ہوں۔ اور شیعہ ہونے سے ان کی مراد اثناعشری /امامی شیعہ ہونا ہوتی ہے۔ میرا ان کو تاریخ میں پروٹو سنّی شیعان آل محمؐد کے ثقہ ماہرین تاریخ جن میں ابو مخنف بھی شامل ہے کے بارے میں بتانا بھی بیکار جاتا ہے۔ ایسے ہی اس موضوع پہ کام کرنے والے غیرمسلم مشتشرقین اور مارکسی ، سوشلسٹ اور سیکولر ملحدین دانشوروں کے کام کی

تفصیل بتانا بھی بے کار جاتا ہے۔ میں اپنے گہرے مطالعے سے اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں پہلی صدی ھجری سے شروع ہونے والی علوی تحریکیں مسلم سماجوں کی "عوامی تاریخ" کا حصّہ ہیں اور یہ کسی مذہبی فرقے کی تاریخ نہیں ہیں بلکہ اپنی بھرپور عوامی۔
سماجی۔طبقاتی بنیادیں رکھتی ہیں جو درباری اور سرکاری حکمران طبقات کی تاریخ سے الگ ہیں۔ یہ جو 36 ھجری سے شیعان آل محمدؐ کی سماجی-سیاسی تاریخ ہے یہ جہاں آل محمدؐ سے عقیدت و محبت کا عوامی اظہار کی تاریخ ہے وہیں یہ ابتدائی مسلم معاشروں کے کچلے ہوئے مجبور و محکوم عوام کی جدوجہد کی تاریخ بھی ہیں۔ اسے تاریخ کے میکانکی مادیت پرست نظریات اور حکمران طبقات پرست تاریخ کے زیراثر بنائے جانے والے نظریات کے بل بوتے پہ محض فرقہ پرستانہ تاریخ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس عوامی تاریخ کو ہندوستان میں ماقبل نوآبادیاتی دور کے اشراف طبقات کی کئی ایک پرتوں، نوآبادیاتی دور کے بنے بیوروکریٹک ڈھانچے میں موجود شیعہ پرت اور نوآبادیات دور کے شیعہ نواب، جاگیردار، زمیندار اشرافیہ اور سرمایہ دار پرتوں کی وجہ سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی غلط طور پہ پنجاب میں 1984ء میں سپاہ صحابہ پاکستان کے جنم کو سرائیکی وسیب کے شیعہ جاگیرداروں کے خلاف ردعمل کانتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی تاریخ کی مادی جدلیاتی تعبیر نہیں ہے۔
سامراج محکوم اقوام اور خطوں کے محنت کشوں، مجبور محکوم کچلے

ہوئے اور پسے ہوئے طبقات کو نسلی و مذہبی تعصبات کا نشانہ بناتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی بربریت اور ظلم کے پہلو بہ پہلو یہ جو طالبان، القاعدہ، سپاہ صحابہ، لشکر جھنگوی، داعش جیسی تنظیموں اور ان کے تحت پیدا تحریکیں ہوتی ہیں ان کو کسی بھی لحاظ سے عوام کی مزاحمت کا اظہار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہمیں برطانوی سامراج کے ابتدائی دور میں تحریک جہاد اور 1857ء کی مجاہدین کی تحریکوں کا بھی ازسرنو جائزہ لینا ہوگا تب کہیں جاکر ہم فرقہ پرستانہ اور نسل پرستانہ جذبات کے زیراثر لکھی جانے والی تاریخ کو معروضی سطح پہ دیکھنے کے قابل ہوں گے۔ ہمیں ابتدائی اسلامی تاریخ کے جائزے کے لیے نوآبادیاتی دور میں بنائے گئے تاریخ نویسی کے بنائے گئے اس سامراجی فریم ورک سے سے نکلنا ہوگا جو پہلے تو ماقبل نوآبادیاتی دور کو مسلمان- ہندؤ دور میں تقسیم کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مسلمان دور کو شیعہ-سنّی تقسیم کے فریم ورک میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ہمیں پہلی صدی ھجری کی تاریخ کو اس کے اپنے زمان و مکان سے اٹھاکر اسے 1979ء میں ایران میں آئے شیعہ انقلاب اور اس سے جنم لینے والی ایران- سعودی جیو پالٹیکس اور امریکی سامراجیت کے زیر سایہ مڈل ایسٹ، شمالی افریقہ، جنوبی ایشیا میں سعودی-ایرانی فرقہ وارانہ خارجہ پالیسیوں اور اس کے تحت ہونے والی پراکسی جنگوں سے بننے والی ذہنیت کے زیر اثر دیکھنے کی روش کو ترک کرنا ہوگا۔

یہ ذہنیت ہی ہے جو فالس بائنری کے تحت جبران ناصر، حسین حقانی جیسوں کو پاکستان میں شیعہ نسل کشی کو پہلی صدی ھجری کے مسلم سماج کی سماجی- سیاسی تحریکوں اور تقسیم سے پیدا تنازعے کا تسلسل قرار دینے جیسی علمی بددیانتی کرنے پہ مجبور کرتی ہے اور مظلوم اور ظالم میں برابری کو راستا دیتی ہے۔

جب پہلی صدی ھجری کے شیعان آل محمدؐ قاتلان آل محمدؐ ٹھہرائے جاتے ہیں تو آج شیعہ شناخت رکھنے والے بھی اپنی نسل کشی کے باوجود بطور مظلوم کمیونٹی کے دیکھے اور دکھائے جانے سے انکار کو غالب رجحان بننے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

اب ہم شیعان آل محمدؐ کی تاریخ کے آغاز اور اس کی نشونما کو ابتدائی صدی کی عرب روایت کا جائزہ لیں گے ۔

شیعان کوفہ: چند تاریخی مباحث- مابعد قتل عثمان سے لیکر واقعہ کربلا کی تاریخ سازی کے عمل پہ ایک نظر

پہلی صدی ھجری میں حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل سے جڑے عرصے کو بعض مورخین جدید نے صحابہ کرام رضوان

اللہ اجمعین کے ایک گروہ کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے اسے فتنہ کبیر کا آغاز کہتے ہیں اور اس کے بعد وہ بنوامیہ کے تاریخ نویسوں کی زبان میں ہونے والے واقعات کو اسی فتنہ کبیر کا تسلسل بتاتے ہیں۔

ہمیں حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں جس صحابی رسول سے اس سارے زمانے کو فتنہ عظیم قرار دیے جانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ فرمانات کے مصداق اس زمانے کو ٹھہرائے جانے کے اقوال ملتے ہیں وہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی ذات پاک ہے۔ مدینہ طیبہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ ممتاز صحابی رسول تھے جنھوں نے اس زمانے کو فتنہ عظیم کے ظہور کا زمانہ سمجھا اور انہوں نے بھی اس زمانے میں گوشہ نشینی اختیار کی۔

مورخین جدید میں مصر کے ابو طہ مصری بھی شامل ہیں جو اس عرصے کو فتنہ عظیم سمجھتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے جب منصب خلافت سنبھال لی اور ان سے بیعت کرنے والے کئی ایک جلیل القدر مہاجر و انصاری صحابی رسول آپ کی بیعت کو توڑکر مکّہ سے بصرہ پہنچے اور ایک لشکر تیار کرکے لڑنے کی تیاری کی تو امام علی ابن ابی طالب نے بھی ان کو حجاز کی بجائے عراق میں ہی بصرہ کے قریب روکنے اور ان کے سامنے دو راستے رکھنے کا فیصلہ کرلیا- ایک راستا تو دوبارہ بیعت کے دائرے میں

داخل ہونے کا تھا جبکہ دوسرا راستا ان کو بزور سیف دائرہ بیعت میں لانے کا تھا۔

یہ پہلی مرتبہ ہورہا تھا کہ امت مسلمہ کے سب سے زیادہ محترم و مکرم سمجھی جانے والی شخصیات ایک دوسرے کے مدمقابل تھیں اور عام مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوال جاگزیں تھا کہ ان دونوں گروہوں میں حق پہ کون تھا؟

ہمیں مصنف ابن ابی شیبہ میں جنگ جمل کے موضوع پہ آنے والی روایات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت علی کے لشکر میں بھی کچھ ذہن ایسے تھے جن کے ذہنوں میں یہ سوال گردش کررہا تھا کہ جب دونوں اطراف میں بڑے بڑے مہاجر و اانصار صحابہ کرام ہیں تو پھر حق کا پتا کیسے چلے گا ؟ وہ کس کی طرف ہے؟

یہ بات طے ہے کہ جب مدینہ و مکّہ سے تعلق رکھنے والے مہاجر و انصار صحابہ کا ایک بڑا سیکشن امام علی ابن ابی طالب کی بیعت توڑ کر ان کے مدمقابل آگیا تھا۔ اور دوسری طرف خود مکّہ اور مدینہ میں ایسے صحابہ کرام موجود تھے جنھوں نے پہلے دن سے ہی

امام علی ابن ابی طالب کی بیعت نہیں کی تھی۔ مدینہ اور مکّہ میں جس بڑی تعداد نے امام علی ابن ابی طالب کی بیعت کی تھی ان کی بھی اکثریت مدینہ یا مکّہ سے باہر جانا نہیں چاہتی تھی ایسی صورت حال میں جب امام علی ابن ابی طالب مدینہ سے چلے تو ان کے ساتھ ایک ہزار کا لشکر تھا۔

اس لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالب کی رائے یہ تھی کہ ان کی بیعت توڑنے والے ناکثین اگر دائرہ خلافت میں نہ آئے تو ان سے لڑنا اور واپس دائرہ اطاعت میں لایا جانا ہے-- علی ابن ابی طالب علیہم السلام نے علم جنگ بلند نہیں کیا تھا بلکہ جب ان سے سامنا ہوا تو پہلے ان کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن جب یہ راستا نہ بنا تو مجبوری میں لڑنا پڑا۔ اس واقعے کو "جنگ جمل" اونٹ والی جنگ کہا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور ان کے ساتھ جو جلیل القدر صحابہ کرام تھے ان کی رائے میں حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل سے لیکر ابتک جو واقعات رونما ہوئے تھے وہ اس فتنہ عظیم کی نشانی نہ تھے جس میں قتال سے گریز کرکے گوشہ نشین ہوجانے کا حکم دیا گیا تھا۔ بلکہ امام علی ابن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں

کے نزدیک یہ امت میں انتشار و افتراق ڈالنے اور امت مسلمہ کی وحدت اور جماعت کو تقسیم کرنے کی کوشش تھی اگر ایک فریق مرکز خلافت سے الگ ہوجائے اور وہ مرکز خلافت کے خلاف ہتھیار اٹھالے۔ اسی لیے ہمیں امام علی المرتضی کا وہ قول ملتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر "حق کی پہچان ہوگی تو اہل حق کی پہچان بھی ہوجائے گی اور ایسے ہیجب باطل کی پہچان ہوگی تو اہل باطل کی پہچان بھی ہوجائے گی۔

یہ جنگ 36 هجری میں ہوئی ۔ اور ہمیں اس جنگ کا تفصیلی احوال سب سے زیادہ طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور بلازری کی تاریخ فتوح البلدان میں ملتا ہے۔ طبری نے ابو مخنف سے آٹھ روایات لی ہیں جبکہ باقی روایات اس نے سیف بن عمر تمیمی کوفی سے لی ہیں اور بلازری نے بھی زیادہ تر روایات کے لیے سیف بن عمر تمیمی الاسیدی کوفی پہ اعتماد کیا ہے۔ ابومخنف سے زیادہ تر روایت مجالد بن سعید الھمدانی سے لی ہیں۔ جنگ جمل کا زیادہ تر احوال طبری و بلازری نے ایک اور کوفی عامر بن شراحیل الشعبی کے زریعے کیا ہے۔

اور طبری ، بلازری ، ابوحنیفہ الدنیوری سمیت سب نے لکھا ہے
کہ مدینہ سے سعید بن عاص ،مروان بن عاص،عبدالرحمان بن عاص
اور مغیرہ بن شعبہ الثقفی یہ مدینہ سے مکّہ آنے والے لوگ تھے
جنھوں نے سب نے حضرت علی ابن ابی طالب کے خلاف اعلان
بغاوت مکّہ میں کردیا تھا اور ان کے ساتھ مکہ میں حضرت عثمان ابن
عفان رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ گورنر عامر بن عبداللہ الحضرمی تھا
جس نے اس اعلان بغاوت اور قصاص عثمان کا مطالبہ کردیا تھا۔

ہم جب جنگ جمل، جنگ صفین ، واقعہ کربلا بنوامیہ کے
بادشاہوں خاص طور پہ عبدالملک بن مروان جس کے دور میں
اموی حکومت بہت زیادہ مستحکم ہوئی کا رویہ دیکھتے ہیں تو
ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ انھوں نے شعبی اور محمّد بن شہاب زھری
کو ترجیح دی اور جو علمائے جرح و تعدیل ہیں انھوں نے بھی ان
دونوں کو نہ صرف امامین المحدثین مانا بلکہ ان کو تاریخ کے باب میں
نصف ھجری کے بعد ہونے والے واقعات کی تاریخ میں بھی بہترین
قرار دیا۔ بلکہ ان علمائے جرح و تعدیل نے تو جس سیف بن عمر
تمیمی کو حدیث میں کذاب، مختزق اور متروک ٹھہرایا تھا اسے تاریخ و
اخبار کے باب میں عمدہ راوی قرار دے ڈالا۔ کیوں؟ وہ زیادہ تر
ایسی روایات بیان کرتا ہے جو بنوامیہ کو طاقت فراہم کرتی ہیں۔

لوط بن یحیحی ابومخنف جمل و صفین کا بنیادی اور واحد راوی ہے ۔ اس نے "کتاب صفین" کے نام سے کتاب لکھی ۔ کتاب "انساب الاشراف" میں ابن سعد نے "کتاب جمل " کے عنوان سے ابومخنف سے مروی احادیث جو درج کی ہیں ان کی تعداد تینتیس بنتی ہے۔ جنگ جمل بارے ابومخنف کی روایات کردہ اخبار میں سے بعض خبریں تفصیل کے ساتھ ہیں۔ علماء جرح و تعدیل کے نزدیک عراق کی تاریخ کی تدوین جس شخص نے سب سے پہلے کی وہ ابومخنف ہی ہیں۔ اب یہاں ایک فرق ملحوظ خاطر رہے کہ علماء جرح و تعدیل جو ہیں وہ ابومخنف کو روایت میں اسے غیرثقہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ اس کو متروک قرار دیتے ہیں۔

ابن ندیم نے ابومخنف عراق کے معاملے میں اور اس کی فتوحات کے بارے میں دوسرے راویوں کو سب سےبرتر قرار دیتے ہیں۔
کتاب"یاقوت الحموی فی معجم الادباء" نے ابومخنف کے بارے میں کہا کہ وہ فتوحات و جنگ ہائے اسلام کا اولین خبرنگار تھا۔(جلد17 صفحہ 41)

پہلی صدی هجری کی تاریخی اخبار بارے ایک دوسرا راوی سیف بن عمر الاسیدی التمیمی الکوفی ہے۔ علماء جرح و تعدیل اور علم الرحال کے مولفین جیسے ابن معین، نسائی ، حاکم نیشاپوری ، ابن

حبان البستی ہیں وہ اسے احادیث رسول اللہ ﷺ کے باب میں زندیق، کذاب اور فرضی قصّہ گو قرار دیتے ہیں ۔ ان برائیوں کے سبب ماہرین علم الرجال نے اسے احادیث کے باب میں توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ لیکن سیف بن عمر تمیمی فتوحات اسلام اور اس سے متعلقہ اخبار میں ان ہی علماء اسماء الرجال کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور وہ اسے تاریخ کے بیان میں عمدہ شخص قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابن حجر عسقلانی تقریب التہذیب کی جلد ایک ص757 پر اور ذہبی میزان الاعتدال کی جلد 2 ص 303 پر اس کے بارے میں لکھا "بانہ اخباری عارف" یعنی وہ تاریخی خبروں کا عارف ہے۔

اب یہاں پر ہمارے سامنے ایک متضاد صورت حال سامنے آتی ہے۔ علماء جرح و تعدیل جو ہیں وہ ابومخنف کو حدیث میں ضعیف اور کچھ اسے متروک ہونے کی بنا پہ تاریخ کے راوی کے طور پہ بھی مکمل طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض اس کی تاریخ کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ وہ کوفہ کے "رافضی" گروہ میں سے تھا (حالانکہ اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے)۔ جب کہ سیف بن عمر تمیمی جو ہے جس سے امام علی اور ان کے شیعہ کے موقف سے ٹکرانے والی روایات نقل ہوئی ہیں کی طرف یہی علماء جرح و تعدیل دو اطراف میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک فریق وہ ہے جو روایت حدیث میں تو اس کو نہیں مانتے لیکن جو روایات اخبار تاریخی ہیں

ان میں سیف بن عمر تمیمی ان کے نزدیک "ثقہ" ہوجاتا ہے۔ اور تاریخ کے بیان میں بھی عمدہ قرار پاتا ہے۔ تو یہ جو ایک باب میں اس پہ جرح اور دوسرے باب میں اس کی عدالت تسلیم کی جارہی ہے اس میں کس بنیاد پہ ہم کہیں کہ عدل اور انصاف کو ملحوظ خاطر رکھا گیا؟ اور ہم کیسے ان مرویات سے دور ہوسکتے ہیں جن کو جھوٹا اور کمزور قرار دیا گیا؟ اور وہ ایسی روایات ہیں اگر ہم تدوین تاریخ میں ان مرویات سے دور ہوجائیں تو ابتدائی اسلامی تاریخ کے مطالعے میں بہت بڑے خلا سے دوچار ہوجائیں گے۔ اور ہم اس شخص کو بہت بڑے واقعات تاریخ واخبار کی روایات میں سچا کیسے کہہ سکتے ہیں جس سے جھوٹ اور کمزوری کی نسبت کی گئی ہو اور اسے مختلق و متروک راوی حدیث کہا ہو ان لوگوں نے جو جرح و تعدیل رجال کے باب میں بہت بڑے عالم ہیں؟

اس مشکل اور متضاد صورت حال سے نکلنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جنگوں اور انقلابات کی جو تاریخ ہے اسے ہم دوبارہ سے دیکھیں۔ اور یہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمل تاریخ میں ہمارے اسلاف کے طریقے کے خلاف ہوگا تو یہ غلط ہے۔ مستشرقین نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کو دوبارہ سے دیکھنے کے لیے جس طریقہ تفتیش کو اپنایا وہ طریقہ تو ہمارے ہی کئی ایک بڑے مورخین تاریخ اسلام نے مشخص کیا تھا۔ ان میں ایک فلسفی تاریخ عرب و

اسلامی ابن خلدون ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ کے علم کی تعریف اس کے باطن میں نظر ڈالنا ، تحقیق اور تعلیل کرنا ہے۔ وہ اس علم کے مبادیات دقیق اور کیفت وقائع اور ان کے اسباب پہ گہری نظر ڈالنے کو کہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ لکھنے والے مصنفین نے ساری اخبار کا فی الاستعیاب احاطہ کیا اور ان کو جمع کیا اور پھر ان کو لکھتے ہوئے دفاتر کے دفاتر تیار کردیے۔ ان اخبار کے دفاتر کے بارے میں یہ دعوا کیا گیا کہ ان میں موجود اخبار میں ٹھیک اور غلط دونوں داخل ہوگئے ۔ دسیسہ کاری ہوئی ، اختراعی باتیں شامل کی گئیں ، وہم اور گمان بھی شامل کردیے گئے اور تو اور موتیوں کے ساتھ کنکر بھی شامل ہوئے۔ اور کہیں تفصیل کی کمی کو پورا کرنے کے کمزور روایات اور گھڑی ہوئی روایات شامل کرلی گئیں۔ اس کا بہت ہی اہمیت کا حامل قول یہ ہے کہ ان کے بعد آنے والوں نے اور ان کی پیروی کرنے والوں نے اسی پر اکتفا کرلیا۔ انھوں نے واقعات و حالات کے اسباب کو نہ دیکھا – نہ ان کی نگرانی کی اور نہ ہی وضعی احادیث کا انکار کیا اور نہ ہی انھیں دور کیا۔ اور اسی لیے تحقیق بہت کم کی گئی ۔ تنقیح نہ ہونے کی وجہ سے غلط اور ٹھیک مدغم ہوگیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں تنفیح کا طریقہ اختیار کرنا ہے-

تو ہم کیسے ان سلبی و ایجابی اخبارات میں تطبیق دے سکتے ہیں جس کا ذکر ابن خلدون نے تاریخ کے بحث کے منہاج میں ذکر کیا ہے ؟

ابن خلدون اسلامی تاریخ کی آٹھویں صدی ھجری کا فلسفہ تاریخ کا ماہر تھا جس نے تاریخی روایات میں پائے جانے والے مذکورہ بالا عیوب کا ذکر کیا۔ اور اس نے اپنی تحقیق میں اسے ان تجربات سے الگ کیا جو چھوتھی صدی ھجری کے زمانے سے چلے آرہے تھے اور وہ طبری و مسعودی و مسکویہ و ابن اثیر و مقریزی سے مماثل تھے۔ اس کے بعد سخاوی کے ہاں بھی یہی تجربہ دہرایا گیا۔ اگر یہ درست ہے کہ آٹھویں صدی ھجری میں ہمارے ہی ایک ماہر تاریخ نے تاریخ اسلامی کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد ڈال دی تھی تو پھر اس خوف کو لوگوں کے ذہن میں ڈالنا کہ تاریخ اسلامی میں کھوٹے کو کھرے سے الگ کرنے کے لیے اختیار کیا جانے والا طریقہ مستشرقین کا ہوجائے گا۔ اسی طرح سے یہ بات کیسے عدل ٹھہرے گی کہ ہم کسی تاریخ کی تصنیف کرنے والے کو یہ کہیں کہ وہ فلاں فلاں مستشرق کے مذہب اور منہج سے متاثر ہے۔

لیکن اگر ہم زرا گہرائی میں جاکر اپنے پہلی چار صدی هجری کے تاریخی ادب کو دیکھیں تو ہمارے سامنے یہ بات آئے گی کہ ابن خلدون نے اگرچہ فلسفہ تاریخ اسلامی پہ ایک نظری مقدمہ دیا لیکن اس نظری مقدمہ سے بہت پہلے ہمارے جو تاریخ کے شیوخ تھے وہ راویان تاریخ اورراویان تاریخ کی مرویات پہ درایت اور تجزیہ و تحلیل کا سلسلہ شروع کرچکے تھے۔

جب کہ ہمارے جو قدیم مرخین اساتذہ تھے انھوں نے ٹھیک اور غلط روایت کی خود پہچان کی ۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ راوی زندیق ہے، وہ راوی متروک و ضعیف ہے ، تیسرا مدلس ہے اور غیر ثقہ ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جب تدلیس و کذب و اختلاق روایات میں بہت زیادہ ہوگیا تو علماء جرح و تعدیل کی ایک پوری جماعت میدان میں اتر آئی اور انھوں نے ان راویوں اور مولفین کے بارے میں ہماری رہنمائی کی ۔ انھوں نے ان راویوں کی تنقید کو واضح کیا ۔ مثبت اور منفی تحریریں لکھیں۔ حقیقت یہ انھوں نے جان لڑا کر اس مواد کو الگ کرنے کی کوشش کی- یہاں پہ ہمیں ایسی کوششیں بھی نظر آتی ہیں جن کا مقصد ایسے راویوں کی روایات کو مشکوک ٹھہرانا تھا جو آل امیہ اور آل عباس کے خلاف برسر پیکار تھے۔ اور آل امیہ اور آل عباس نے کوشش کی کہ ان کے مدمقابل جو

شیعان آل محمؐد کی روایات ہیں ان کو اپنے دربار اور حکومت کے زیرسایہ پرورش پانے والے مورخین کی روایات سے بدل ڈالیں اور شیعان آل محمؐد کو غیر معتبر ٹھہرائیں۔

ہمارے پاس ایسی تالیفات کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ تاریخ کے راویوں کا تنقیدی جائزہ لینے والی کتابیں ہیں ۔ جیسے تاریخ ابن معین جسے معروف محدث عثمان بن سعید دارمی نے "سوالات عن ابن معین عن رواۃ الرجال" کے نام سے مدون کیا۔ ابن معین تیسری صدی ھجری کے کبار اہلسنت علماء میں شمار ہوتے ہیں اور انھیں آئمہ جرح و تعدیل بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح الاسامی و الکنی (اسماء اور کنیت) کتاب ہے جو امام احمد بن حنبل کی کتاب ہے اور یہ بھی تیسری صدی ھجری کے امام اہلسنت ہیں۔ ایسے ہی جوزجانی کی کتاب "احوال الرجال۔۔۔۔" ہے۔ ایسے ہی الیمان العجلی الکوفی کی کتاب "معرفۃ الثقات" اور امام مسلم کی کتاب ہے "الکنی و الاسماء" ۔ یہ سب کتابیں تیسری صدی ھجری کے علماء اسلام کی لکھی کتابیں ہیں جو راویان حدیث و اخبار کی حثیت سے بحث کرتی ہیں۔ ایسے کی بردیجی کی کتاب "طبقات الاسماء المفردہ من الصحابہ و التابعین و اصحاب الحدیث" ، امام نسائی کی کتاب " الضعفاء والمتروکین" ، ابن ابی حاتم کی کتاب

"الجرح و التعدیل"، العقیلی کی کتاب "الضعفاء" ، ابن حبان بستی کی کتابیں "الثقات " "المجروحین" اور "مشاہیر علماء الامضار" طبرانی کی کتابیں " المعجم الکبیر"،"المعجم الوسیظ" اور "المعجم الکثیر" ، ابن عدی الجرجانی کی کتاب"الکامل الضعفا والرجال" اور اسی کی کتاب "تصحیفات المحدثین" عمر بن احمد بن ازداد کی کتاب "ذکر من اختلف العلماء و فقھا الحدیث" ، ابن شاہین کی "تاریخ اسماء الثقات"، ابن ندیم کی "الفھرست"، الکلاباذی کی کتاب "رجال الصحیح بخاری" ہے ۔ اور یہ سارے علماء چوتھی صدی ھجری کے علماء ہیں۔ اور ایسی کتابیں لکھنے والے ہمیں پانچویں صدی ھجری کے علما ملتے ہیں۔

اب ان علماء کی جو اس قسم کے علم کی تدوین ہے اس سے ہم کیا نتیجہ نکالیں؟ اور ہم کیسے اس کی تفسیر کریں جبکہ جو تاریخ اور سب سے اہم علم حدیث میں تدلیس ہوئی اور جو گھٹایا بڑھایا گیا اس پہ وہ متفق نہیں ہیں؟ اور وہ جو کہتے ہیں کہ ان روایات کی جو ابتداء اس کی درایت نہیں ہوئی ہے؟ ان کی بات کو کہاں رکھیں؟ ٹھیک بات یہ ہے کہ ہمارے مذکورہ بالا علماء نے اپنے آپ کو تاریخ اور حدیث کی تدوین ، اس کی تصحیح اور اور اس میں رطب و یابس آیا اس کو الگ کرنے کے لیے بہت کوشش کی اور اپنی زندگیاں اس کام کے لیے لگادیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں نے ان

روایات کو الگ کیا جو زمانہ اموی و زمانہ عباسیہ میں شیعان آل محمؐد کی روایات کے مدمقابل گھڑی گئی تھیں۔

اب ہمارے سامنے پہلی صدی ھجری کی تاریخ کی اخبارات کے اولین راوی جو ہیں ان کے نام یہ ہیں

سیف بن عمر الاسیدی التمیمی الکوفی ، ابو مخنف، واقدی ، ہشام

یہ جو سیف بن عمر الاسیدی تمیمی ہے اس کی ولادت کوفہ میں ہوئی ۔ علماء جرح وتعدیل نے اس کو کذاب کہا ۔ اس کا دین زندقہ بتایا۔ کچھ نے کہا کہ وہ ساقط الحدیث ہے۔ اسے ضعیف اور متروک الحدیث کہا گیا اور یہ تک کہا گیا کہ وہ کوئی شئے ہی نہیں ہے۔ اسے ایک طرف حدیث کی روایت میں متروک راوی کہا گیا۔

دوسری طرف محمؐد بن عمر واقدی ہے ۔ جتنے اسلامی غزوات ہیں ان کا یہ سب سے بنیادی راوی ہے۔ علماء جرح و تعدیل نے اسے ضعیف اور لیس بشیء کہا۔ جیسے امام شافعی نے کہا کہ واقدی جھوٹا ہے۔ امام احمد بن حنبل کو اس سے شکایت ہے کہ وہ احادیث کی اسناد اور متن حدیث بدل دیتا ہے۔ اور جان بوجھ کر

جھوٹ بولنے والا قرار دیا۔ ابن معین کہتا ہے کہ اس کی بیان کردہ حدیثوں کو ردی قرار دیتے ہیں۔ اور انھوں نے اس پہ حدیثیں گھڑنے کا ماہر کہا۔

اب اگر صورت حال ان راویوں کے حوالے سے ایسی ہے تو ان سے روایات کی طرف متوجہ ہونے والا ایک تو سخت متحیر ہوگا،دوسرا وہ ان مورخین اور راویوں کی روایات کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے گا۔ ان دونوں حالتوں میں اس پہ یہ لازم آئے گا وہ اکثر روایات تاریخ ہی نہیں بلکہ احادیث پہ بحث کا جو منہاج ہے اسے ساقط کردے۔ اور جب ہم اپنے موضوع جمل وصفین کے معرکوں کی نسبت اسے دیکھیں تو ہمیں ان علماء کے موقف کا بھی جائزہ لینا ہوگا جو سیف بن عمر کی روایت حدیث پہ تو شدید حرح کرتے ہیں اور وہ اس کی اس بارے میں اخبار کو ایک ثقہ آدمی کی اخبار کے طور پہ لیتے ہیں۔ ایسے میں تو اس کی روایات تاریخ سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکے گا اور ان کے درمیان سرخ اور کالی لکیریں نہیں کھینچی جاسکیں گی۔ یا اس میں جو روایات طبری نے اس موضوع پہ اس سے لی ہیں انکے بارے میں جرمن مستشرق بروکلمان توقف کرتا ہے اور وہ سیف بن عمر پہ قبائل کی اخبار، ان کے فخر، ان کے اقدامات اور جنگ کے دنوں کا وہ جو ذکر کرتا ہے ان میں غلو کرنے کا الزام لگاتا ہے۔ وہ اسے

تحریف روایات ، تدلیس سے تعبیر کرتا ہے۔ سیف بنی تمیم اور بنی اسد کے جن لوگوں کی روایات لیتا ہے اور اسے بیان کرتا ہے تو وہ ان کے نام تک بھول جاتا ہے۔ ایسے میں ہم اس سے روایات ہونے والی اخبار کی تنقیح کیسے کریں گے؟ اور ہم اس کی بیان کردہ اخبار کی توثیق کیسے کریں گے؟

اب اس کے مقابلے میں دوسرا راوی ابو مخنف ہے۔ ہم اسے مدرسہ اخبارات عراقیہ کا بانی کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ابومخنف تاریخ عراق کا ایک ایسا راوی ہے جس کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کا بالاتفاق خیال ہے کہ وہ عراق کی خبریں بیان کرنے میں صادق بھی ہے اور ثقہ بھی ہے۔ حدیث کی روایت کے باب میں کسی ایک محدث نے اس پہ نہ تو جھوٹ کا الزام لگایا نہ اس پہ مختلق الاحادیث کا الزام لگا، نہ اس پہ متون حدیث و اسانید کو بدل ڈالنے کا الزام لگا اور نہ ہی اس کو مذہب کے باب میں زندیق ہونے کا لقب دیا۔ ابومخنف پہ دوسری و تیسری صدی ھجری کے کسی ماہر علم جرح و تعدیل نے "رافضی" نہیں لکھا۔ ہاں اس کو "شیعہ" لکھا گیا اور ہم سب جانتے ہیں کہ پہلی صدی ھجری کے جن لوگوں پہ لفظ شیعہ کا اطلاق کیا جاتا ہے ان میں سے ایک بھی راوی ایسا نہیں ہے جسے حدیث کے باب میں جھوٹا کہا جاسکے۔ ابو مخنف

صرف اخبار عراقیہ مدرسے کا بانی نہیں ہے بلکہ وہ اصحاب اخبار کوفہ کا استاد بھی ہے اور ان کا غالب چہرہ بھی۔ وہ خود بھی صاحب تصانیف ہے اور خود راوی اخبار بھی ہے۔ پہلی صدی ھجری کے عراق اور کوفہ سے تعلق رکھنے والی روایات کے حوالے سے طبری اور بلازری نے بھی اسی پہ اعتماد کیا۔

ہمارے زیربحث موضوع میں ایک اور شخصیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ محمّد بن شہاب زھری متوفی 111ھجری ۔ زھری حدیث اور تاریخ دونوں کی تدوین میں اہمیت کا حامل ہے۔ علماء جرح و تعدیل نے اس کی عظیم ثقاہت اور صاقت پہ مکمل اتفاق کیا ہے۔ اسے مدرسہ مدینہ کا بانی کہا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کی امام علی ، معرکہ جمل و صفین بارے روایت کردہ اخبار دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں معاویہ ابن ابی سفیان اور امویوں کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے۔ اور اموی بادشاہوں اور گورنروں اور امرآ کے ساتھ اس کے گہرے مراسم نظر آتے ہیں۔ اموی خلفاء تاریخ اسلامی، زمانہ حیات رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے حالات معلوم کرنے کے لیے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے – اب اس کے جواب کیسے ہوسکتے تھے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ پھر وہ اسے اپنے دربار اور لگائی گئی عدالت میں طلب کرتے تھے تاکہ اس سے تاریخی امور بارے فیصلہ سنیں چاہے وہ زھری کو پسند آئے یا نہیں تو ایسے

موقعہ پہ زھری جو بیان کرتا وہ اسے اس کے نام سے اپنے ماتحت علاقوں میں پھیلا دیا کرتے تھے۔ بلازری کے ہاں زھری انساب کے بیان میں اور صفین کے معرکہ کے بیان میں اکثر واقعات کا راوی بن جاتا ہے- بلازری زھری سے 22 روایات لیتا ہے معرکہ صفین کے بارے میں جن میں وہ اموی روایات یا امویوں کی تائید کرنے والی روایات کو مقدم رکھتا ہے۔ اب اگر ہم اس کے حدیث اور تاریخ میں مدینہ کے مدرسہ کے علمبردار ہونے کو منفی معانی میں نہ بھی لیں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کا عبدالملک بن مروان، ولید بن مروان ، عمر بن عبدالعزیز، ولید بن یزید اور ہشام بن عبدالملک کے درباروں کے ساتھ وابستگی رہی ہے۔ اس کی جو مرویات ہیں اور اس کا جو موقف ہے اور اس کے جو جوابات ہیں ان کو ان سب بادشاہان امیہ نے تعریف و تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تو ایک خط اپنے گورنروں کے نام جاری کیا تھا جس میں انھوں نے لکھا،"تم سب پر ابن شہاب کی اطاعت لازم ہے کیونکہ وہ تم سب میں اللہ کی قسم ماضی کے زمانوں کا سب سے بڑا عالم ہے"(ابن ابی حاتم :الحرح و تعدیل جلد ہشتم صفحہ 171) یہ قول ٹھیک ہی ہوگا لیکن اس کو ہم اس زاویے سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اموی بادشاہوں کے نزدیک اس لیے ثقہ ٹھہرا کہ وہ اپنی رائے کو ان کی مرضی کے مطابق تشکیل دیتا رہا ہوگا۔ اگر ہم حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں

اس کی روش سے صرف نظر کرلیں تو باقی بادشاہان بنی امیہ تو سارے کے سارے وہ تھے جن کے ادوار میں ان کے گورنر ان سب لوگوں کوخون میں نہلاتے رہے جو علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور آل محمؐد کے پیرو تھے اور جبر و طاقت سے ان کو علی ابن ابی طالب اور دیگر اہل بیت کے فضائل کی احادیث بیان کرنے سے روکتے رہے۔ ابن شہاب زھری کے بارے میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ جس زمانے میں اس کے اموی بادشاہوں سے گھرے تعلقات تھے اسی زمانے میں وہ مدینہ کی مسجد میں امام علی بن حسین السجاد زین العابدین، امام باقر علیھم السلام کے مدرسہ میں بھی بیٹھتا رہا اور اس نے امام زین العابدین و امام باقر سے روایات بھی بیان کیں۔ یہاں تک کہ امام احمد بن حنبل نے زھری کی امام زین العابدین سے بیان کی گئی روایات کو قابل اعتماد بھی قرار دیا-

(دیکھیے مسند امام احمد تحقیق محمؐد محمود شاکر القاھرہ جلد 3 حدیث رقم 1882 تا 1883 ، طبقات ابن سعد جلد 3 صفحہ 186)

امیر شام کے حوالے سے روایات کا ایک منبع ہشام بن عمار دمشقی ہے اور اس پہ بلازری نے اپنی کتاب"انساب الاشراف" میں مکمل انحصار کیا ہے۔ اس سے کل 27 روایات نقل کی ہیں اور سب کی سب ایسی ہیں جن کی بنیاد اور سراغ ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔

ہشام دربار امیر شام کا خاص مقرب بھی تھا۔ اسی ھشام نے معاویہ ابن ابی سفیان کی بیٹی رملۃ سے بھی روایات درج کی ہیں اور اس نے ہی حضرت عمر بن خطاب سے یہ بات منسوب کی کہ انھیں امیر شام میں کسری عرب / عرب کے بادشاہ کی صورت نظر آتی ہے اور یہ بھی بلازری کی کتاب انساب الاشراف میں نقل ہوئی ہے اور اس روایت کا سراغ ہمیں مدینہ و مکّہ کے مدرسہ حدیث و تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔

یہاں ہمیں اپنے موضوع سے متعلق ایک اور شخصیت کو بھی زیربحث لانا ہے اور وہ شخصیت ہے عامر بن شراحیل بن عبد الشعبی ہے۔ یہ کوفہ میں 24 ھجری میں پیدا ہوا اور 104 ھجری میں کوفہ میں ہی اس کی وفات ہوئی۔ اس اعتبار سے اس کی عمر کل 80 سال بنتی ہے۔ اس نے کل 50 صحابہ کرام سے حدیث روایت کیں۔ اور صحاح ستہ کا یہ بہت مشہور راوی ہے۔ یہ ایک ایسے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو کوفہ میں حضرت علی ابن ابی طالب علیهم السلام کے سب سے زیادہ وفادار قبائل میں سے ایک تھا۔ اس کی سیاسی وفاداریاں بدلتی رہیں۔ جب حضرت علی ابن ابی طالب کوفہ میں تشریف لائے تو اس کی عمر اس وقت 13 سال ہوگی۔ اس لیے اس زمانے میں اس کے بارے میں ہمیں تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت 40 ھجری میں ہوئی

تو اس کی عمر اس وقت 17 سال کی ہوگی۔ اور ہمیں یہ بالکل خبر نہیں ملتی کہ شعبی امیر شام کے مقرر کردہ گورنران کوفہ مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن ابی سفیان اور پھر نعمان بن بشیر کے زمانے میں بھی ہمیں شعبی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ پہلی بار شعبی کے سیاسی رجحان کی خبر ہمیں مختار ثقفی کے کوفہ پر قبضے کے وقت ملتی ہے جب یہ اس کے مقربین کے طور پہ سامنے آیا لیکن جلد ہی یہ مختار سے منحرف ہوکر بصرہ فرار ہوگیا اور وہاں سے یہ مدینہ پہنچا اور اس کی ملاقات وہیں حجاز پہ قابض مصعب بن زبیر سے ہوئی اور جب مختار قتل ہوگیا تو یہ مصعب بن زبیر کا مقرب بن گیا اور مصعب بن زبیر نے اسے دس ہزار درہم دیے۔ اور یہ مصعب بن زبیر کے گن گانے لگا اور بلازری نے اس سے مصعب کے حق میں یہ روایت نقل کی ،"میں نے مصعب سے زیادہ منبر پہ تشریف فرما امیر کبھی نہیں دیکھا"(انساب الاشراف جز 4 صفحہ 71) اور جب عبدالملک بن مروان نے مصعب کو قتل کرکے اقتدار سنبھالا تو شعبی اس کے ساتھ مل گیا۔ اوراس کا یارانہ عبدالملک کے بھائی بشر بن مروان گورنر عراق کے ساتھ ہوگیا اور یہ اس کی جلوت و خلوت کا ساتھی ہوگیا اور اس کے گھر پہ سجنے والی محفلوں کا یہ لازمی شریک ہوا کرتا تھا۔ جب حجاج بن یوسف عراق کا گورنر ہوا تو اس نے شعبی کو اپنے دربار میں بلایا اور بقول اس کے اس نے اس سے کچھ چیزوں کے بارے میں سوال کیا اور اس کی میرے

جواب سے تشفی ہوگئی۔ حجاج کن چیزوں کے بارے میں اس سے پوچھ رہا تھا یہ بات شعبی نے نہیں بتائی لیکن سب کو پتا ہے کہ حجاج بن یوسف نے کوفہ و بصرہ کی گورنری پہ فائزہونے کے بعد کوفہ میں اپنے دربار میں سب سے پہلے اپنے جاسوسوں سے یہی پوچھا تھا کہ کوفہ میں شیعان آل محمؐد کے سرگرم لوگ کون ہیں اور مختار ثقفی کی باقیات میں کون ہیں۔ اور قوی امکان ہے کہ اسے شعبی کی مختار ثقفی سے وابستگی بارے بتایا گیا ہو اور وہ شعبی کو علوی تحریک کا خفیہ رکن سمجھا ہو۔ حجاج بن یوسف کو شعبی نے کیسے مطمئن کیا ہوگا؟ اس بارے میں تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن حجاج کی قربت اور اس کی نگاہ کرم کی سب سے بڑی شرط علی ابن ابی طالب اور آل محمؐد سے اظہار برآت ہی کافی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان پہ سب و شتم بھی لازم تھا۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ کسی حدیث کے بڑے عالم کے لیے اس دور میں یہ لازم تھا کہ وہ نہ صرف فضائل علی ابن ابی طالب کو چھپائے بلکہ ان کے مقابلے میں فضائل آل امیہ کو فروغ بھی دے۔ شعبی سے ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یہ روایت درج کی ہے کہ اس پوچھ گچھ کے دوران حجاج نے اسے عارف پایا اور اسے اپنا خاص مقرب بنالیا اور اس کو بہت بڑا رتبہ دیا اور یہ مقام اس سے اس نے کبھی نہ چھینا۔۔(جلد اول ص 85) اس کے بعد شعبی نے حجاج کا ساتھ اس وقت چھوڑ دیا جب عبدالرحمان الاشعث نے خروج کیا تو یہ اس کی طرف مائل ہوگیا

لیکن جیسے ہی وہ شکست کھاگیا تو یہ اموی سپاہ سالار قتیبہ بن مسلم الباھلی کے پاس جاپہنچا اور اس کو شیشے میں اتارا اور اس سے کافی مال بھی لیا اور قتیبہ بن مسلم الباہلی نے ہی اسے حجاج کے دربار میں لیجاکر اس کی جان بخشی کرائی اور دوبارہ تقرب بھی دلایا۔ شعبی نے نفع بخش سیاست کو اپنا راستا بنایا اور اسی کوشش نے اسے عبدالملک بن مروان کا ملازم بنادیا جہاں یہ اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت پہ مقرر ہوا۔ یہ عبدالملک بن مروان کے اتنا قریب ہوا کہ اس نے اسے روم اپنا سفیر بناکر بھیجا۔ عبدالملک بن مروان کے ہاں سالوں گزار کر یہ پھر عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر کے دربار سے منسلک ہوگیا- عبدالملک بن مروان کے بارے میں اس نے تعریفوں کے پل باندھے اور علم حدیث میں اس کو بہت بڑا عالم و حافظ ثابت کیا اور یہاں تک کہا کہ اس نے جو بھی حدیث کسی صحابی سے سنی تھی کوئی ایسی نہ تھی جو عبدالملک نے نہ سن رکھی ہو اور اس میں وہ مجھ سے سبقت نہ لے گیا ہو۔ آج کے دور میں ہم جسے حکمرانوں کی امیج بلڈنگ کہتے ہیں شعبی نے عبدالملک کے باب میں اسی میں مہارت حاصل کررکھی تھی۔ اس طریقے سے شعبی نے بنوامیہ کی امیج بلڈنگ کی ۔ اس نے کسی طریقے سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تقرب حاصل کیا اور انھوں نے اسے کوفہ کا قاضی مقرر کردیا۔ اس کے بعد یزید بن عبدالملک کی بادشاہی کے زمانے میں اس نے عراق کے گورنر عمر بن ھبیرہ کا

تقرب حاصل کیا۔ اور جب گورنر عراق کو اموی خلیفہ کے مفاد میں کسی مسئلے میں فتوا درکار ہوتا تو شعبی اس کے لیے راہ ہموار کرتا اور والی عراق کے زریعے سے اسی مناسبت سے فتوا خلیفہ کو بھجوا دیا جاتا ۔ شعبی ان فقہا میں شامل تھا جس نے یہ فتوی دیا تھا کہ حاکم کی اطاعت رعایا پہ فرض ہے چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ شعبی پوری زندگی بنوامیہ کے بادشاہوں،گورنروں اور امرا کے ساتھ جڑا رہا اور ان سے منفعت مادی لیتا رہا۔

بلازری شعبی کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ جبکہ شعبی اپنی پوری زندگی میں جب بنوامیہ والے برسراقتدار آئے تب سے ان کے جواز حکمرانی کے لیے عذر تلاش کرتا رہا۔

میں نے جب جب طبری اور بلازری کی کتب میں میں دور خلافت علی المرتضی ابن ابی طالب، جمل و صفین اور امویوں کے بارے میں خبروں کی ابتدائی راویان کی تفصیل پہ غور و خوض کیا تو میرے سامنے یہ بات آئی کہ انھوں نے ایسے ابتدائی راویوں پہ اعتماد کیا جو بنوامیہ کے مقربین میں سے تھے اور ان میں ایک شعبی بھی تھا جس کا ذکر میں نے تفصیل سے کردیا۔ اور ان میں ایسے راوی زیادہ ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور یہاں تک کہ ان پہ نسیان کا الزام بھی لگایا گیا۔ شعبی نے ان اخبار کے لیے جن راویوں پہ زیادہ

انحصار کیا ان میں ان میں الھمدانی السری بن اسماعیل اور مجالد بن سعیدالھمدانی الیمانی الکوفی بھی ہیں لیکن شعبی سے ان کی روایات اکثر مشکوک ہیں کیونکہ ابومخنف و نصر بن مزاھم نے ان سے جو روایات درج کی ہیں وہ شعبی سے مروی روایات سے متعارض ہیں۔

اسلامی فتوحات اور بڑے واقعات جو نصف اول ھجری میں رونما ہوئے تو ان کو پہلے زبانی روایات کے زریعے سے بیان کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور بعد ازاں ایک ایسا گروہ اہل علم سامنے آیا جنھوں نے ان روایات کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع کیا اور انھوں نے ان واقعات پہ الگ الگ رسائل مدون کرنے شروع کیے۔ جیسے مدائنی اور ابو عبیدہ معمر بن المثنی ، الھیثم بن عدی اور ابومخنف نے ابتدائی صدی ھجری کے نصف میں ہونے والے معرکوں پہ الگ الگ رسالے مدون کیے۔ اور المیہ یہ ہے کہ ان مدون رسائل کی اکثریت ضایع ہوگئی اور ان کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ ان رسائل پر دوسری اور تیسری صدی ھجری کے بڑے مورخین نے اعتماد کیا اور ان روایات کو اپنی کتابوں میں شامل کیا۔ ان میں بلازری، یعقوبی، ابی حنیفہ دینوری اور طبری شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ان کبار مورخین نے جن رسائل میں آنے والی روایات کو لیا تو وہ راوی اور رسائل مدون کرنے والے بھی پہلی صدی ھجری

کے نصف میں ہونے والے واقعات کے پس پردہ جو سیاسی-سماجی تحریکیں اور صف بندیاں تھیں وہ ان میں سے کسی نہ کسی سے وابستہ تھے اور ان وابستگیوں کو یا تو ان رسائل کے مدون کرنے والوں نے خود ظاہر کردیا یا ان روایات کے متون کے داخلی تجزیوں سے ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ جن اولین مورخین نے نصف صدی ھجری کے دوران ہونے والے معرکوں پہ الگ الگ رسائل مدون کیے انہوں نے اپنے عہد کے راویوں اور روایات پہ ہی اکتفا کیا۔

مثال کے طور پہ ہمیں "جنگ جمل" پہ سب سے پہلے جس رسالے کا سراغ ملتا ہے وہ رسالہ نصر بن مزاحم متوفی 71 ھجری کا ہے جس کا نام "وقعۃ الجمل" ہے۔

دوسرا رسالہ وہ ہے جو ابومخنف متوفی 80 ھجری کا لکھا ہوا ہے جس کا نام "کتاب الجمل" ہے۔

تیسرا جو رسالہ ہے وہ "وقعۃ الجمل" کے نام سے محمؐد بن زکریا بن دینا الغلابی متوفی 148 ھجری سے لکھا ہوا رسالہ ہے۔

چوتھا رسالہ سیف بن عمر الاسیدی التمیمی الکوفی متوفی 180 ھجری نے لکھا ہے۔

پانچواں رسالہ مدائنی "کتاب الجمل" ہے جن کی وفات 235 ھجری میں ہوئی تھی۔

رسالہ عبداللہ بن جابر بن یزید الجعفی متوفی 280 ھجری کا ہے جس کا نام "کتاب الجمل" ہے۔

اسی طرح ابوجعفر علی بن نعمان البجلی نے کتاب"الجمل فی امر طلحہ و الزبیر و عائشۃ" ، ابومحمد مصبح العجلی نے "کتاب الجمل"،ابی المنذو ھشام بن محمد بن السائب الکلبی متوفی 51 ھجری ، ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی ،أبي اسحاق اسماعيل بن عيسى العطار البغدادي، عبد الله بن محمد بن أبي شيبة المتوفی سنة ١٢٣، أبي جعفر احمد بن محمد البرقي كتاب بعنوان (الجمل) أبي اسحاق ابراهيم محمد بن سعيد بن هلال الثقفي الكوفي المتوفى سنة 147ھ/ ٨٩٧ ،غلابی نے واقعہ جمل میں دو کتابیں لکھیں "جمل الکبیر" اور "جمل المختصر"، ابوالقاسم المنذڑ ابن محمد لقا، عبد العزیز بن یحیحی عیسی الجلودی متوفی 332 ھجری ، ابو جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن موسی بن بابویہ القمی متوفی 417 ھجری نے کتاب الجمل لکھی۔

یحیحی بن سلیمان الجعفی (استاد بخاری) ،جابر بن یزید الجعفی ، جابر بن نمیر الانصاری،عمر بن شمر ، ابو مخنف ، اسماعیل بن عیسی العطار بغدادی، نصر بن مزاحم، محمد بن عمر واقدی ، محمد زکریا غلابی، ابراہیم بن الحسین الھمدانی ابوالخطاب ابن دحیۃ الکلبی،

اسحاق بن بشر وغیرہ نے صفین کے واقعہ پہ الگ الگ کتابیں لکھیں۔ اس فہرست کو دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان میں جو پہلی صدی ھجری کے نصف میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے جمل اور صفین دونوں جنگوں پہ کتابیں لکھیں۔ اور بعد میں بھی جنھوں نے جنگ جمل بارے لکھا انھوں نے صفین بارے یں بھی لکھا۔

تاریخ سازی اس طویل درایت پہ مبنی تجزیے سے ہمارے سامنے ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کوفہ میں جس مکتب کو شیعان آل محمدؐ کہا جاتا ہے اس مکتب کے ابتدائی مورخین جن میں سرفہرست ابومخنف، نصر بن مزاحم ہیں ان کو تاریخ کے بیان کے باب میں ویسے ہی رد کردیا جاتا ہے جیسے اس مکتب سے تعلق رکھنے والے وفا شعاروں کو رد کردیا گیا اور ان کی قربانی کو دھوکہ دہی، فریب اور غداری کے الزامات کے پیچھے چھپا دیا گیا۔ ان کے بارے میں جو مواد ابومخنف و نصر بن مزاحم جیسوں نے اکٹھا کیا تھا اسے بھی غیرمستند کہہ کر رد کرنے کی کوشش ہوئی۔ کیونکہ وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے موقف کو صاف اور شفاف طریقے سے پیش کررہے تھے۔

طبری نے جنگ جمل کے واقعات کی تفصیل میں اہل کوفہ کی حمایت کے لیے اصحاب جمل کی طرف بھیجے گئے خطوط کی تفصیلات لکھی

ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ کوفہ میں جو بعد ازاں کبار شیعان آل محمدؐ میں شمار ہوئے ان میں سے کچھ کے جوابات بھی تحریر کیے ہیں۔ ان میں ایک جواب صوحان بن زید کا بھی ہے جو جنگ جمل میں میں معروف ناصبی ابن یثربی کے ہاتھوں شہید ہوئے اور ابن یثربی جنگ جمل کے وقت یہ رجز پڑھ رہا تھا

اضربهم ولا اری اباحسین – کفی بها حزنا من الحزن

انا نمر الامرار الرسن

میں لوگوں کی گردنیں مار رہا ہوں لیکن ابو الحسین کو نہیں دکھ پارہا- ہم تو وہ لوگ ہیں جو دار پہ بھی اپنا کام کرجاتے ہیں

ابن یثربی نے امام علی علیہ السلام کے تین ساتھیوں کو جنگ میں شہید کرنے کے بعد عمار بن یاسر کے سامنے آکر یہ اشعار پڑھے

انا لمن ینکر في ابن یثربی – قاتل علباء و هند الجملی

و ابن صوحان علی دین علي

میرے ابن یثربی ہونے کا کون انکار کرسکتا ہے- علباء و ھند الجملی اور ابن صوحان کو قتل کیا جو دین علی پہ تھے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ ناصبیت قدیمہ کے لوگ جہاں حضرت علی ابن ابی طالب علیھم السلام سے ہی نہیں بلکہ ان کے

شیعان سے بھی شدید نفرت تھی اور وہ اس کے قتل پہ کس قدر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔

ابوحنیفہ دینوری نے ایک طویل قصّہ کوفہ کے شعیان آل محمؐد کی وفاداری پہ مہر ثبت کرنے والا لکھا ہے جسے وہ "وقعۃ الجمل" کے عنوان میں لیکر آئے ہیں:

حضرت علی ابن ابی طالب کو جب اصحاب جمل کی جانب سے کوفہ والوں کو خطوط روانہ کرنے کی اطلاع موصول ہوئی تو آپ نے ھاشم بن عتبہ بن ابی وقاص ،امام حسن اور عمار یاسر کو کوفہ روانہ کیا۔ یہ سب ذی قار سے کوفہ پہنچے تو اس روز حضرت موسی اشعری رضی اللہ عنہ بھی کوفہ ہی میں تھے۔ وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ ان کے خطاب کو سنتے ہوئے متوحش دکھائی دے رہے تھے۔(دینوری ان کا پورا خطبہ نقل کرتا ہے) اس کا لب لباب یہ تھا کہ لوگ اپنی تلواروں کو توڑ دیں اور گھر بیٹھ جائیں یا دور دراز مقامات پہ چلے جائیں اور کسی کا ساتھ نہ دیں کیونکہ یہ وہ ایام فتنہ تھے جس میں مبتلا ہونے سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ جب ابو موسی اشعری نے اپنا وعظ مکمل کرلیا تو پھر امام حسن کھڑے ہوئے آپ نے تقریر کی ۔ آپ کے

بعد عمار یاسر بولے اور پھر حجر بن عدی نے لوگوں سے کہا کہ امیر المومنین کا ساتھ دیں۔ان کے یہ کہنے کی دیر تھی لوگوں کی اکثریت نے کہا

سمعنا و اطعنا – ہم نے سنا اور مان لیا" اور پھر حلف دیتے ہوئے " کہا

ہم چاہے آسانی ہو یا تنگی ، شدت ہو یا پھر گردن ماری جائے علی ابن ابی طالب امیر المومنین علیہ السلام کے نکلیں گے۔ امام حسن کہتے ہیں کہ اگلی صبح تک کوفہ سے 9 ہزار 7 سو 50 لوگوں کا لشکر تیار ہوگیا تھا اور یہ لوگ ذی قار میں جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ٹھہرے ہوئے تھے آکر مل گئے۔ وہاں کوفہ کے گرد و نواح اور بصرہ سے بھی لوگ آکر آپ کے ساتھ لشکر میں شریک ہوئے۔ آپ نے اپنے لشکر کو ساتھ ٹکڑیوں میں بانٹ دیا اور ان کو سات علم دیے۔

بنوحمیر و ھمدان قبائل کو ایک جھنڈا دیا اور ان کا سالار سعید بن قین ہمدانی کو بنایا-

مذحج و اشعرین کو دوسرا جھنڈا دیا اور زیاد ابن النظر الحارثی کو ان کا نگران بنایا

تیسرا علم قبیلہ طئے کے لوگوں کو دیا اور ان کا نگران عدی بن حاتم الطائی کو بنایا

چوتھا جھنڈا قیس، عبس اور ذیبان قبائل کے مشترکہ اتحاد کو دیا اور ان کا ولی سعد بن مسعود الثقفی کو مقرر کیا

پانچواں جھنڈا کندہ و حضرموت،قضاعہ کو دیا اور نگرانی حجر بن عدی کو دی۔

چھٹا علم ازد و بجیلہ ،خثعم و خزاعۃ کو دیا جن کا ولی مخنف بن سلیم کو ٹھہرایا

ساتوآں علم قریش ، انصار اہل حجاز کو دیا اور ان کا ولی عبداللہ بن عباس کو ٹھہرایا۔

دینوری آخر میں یہ لکھ کر شیعان آل محمدؐ کی وفاداری پہ مہر ثبت کرتا ہے

" ان ساتوں جھنڈوں تلے جمع حضرت علی کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ ملکر جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان لڑیں۔"

ان ساتوں جھنڈوں کے حاملین نے جنگ جمل، جنگ الصفین اور نہروان حضرت علی کے ساتھ مل کر لڑیں

میں تاریخ کی گلیوں میں دیوانگی کے ساتھ پھرا اور مجھے چشم نم کی مسکراہٹ عطا کی گئی

میں 94 هجری کی 25 محرم کی تاریخ کو حجاز کے شہر مدینہ میں بنو ہاشم والوں کے محلے میں پہنچا تو آسمان پر سے چاند نہیں تھا اور ستارے بھی غائب تھے ۔ اور میں نے ایک گھر کے سامنے عورتوں ، بچوں اور ضعیف اشخاص کا ہجوم دیکھا۔ ان سب کی مدھم سسکیاں غم کا ساز و راگ بن کر میرے دل کو غمگین کررہی تھیں ۔ مجھے حالانکہ ماجرا کیا تھا،پتا ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک سسکتی اور آہیں بھرتی عورت سے اس کے غم کا سبب پوچھا تو کہنے لگی،"آج وہ شخص چلا گیا جواپنی پیٹھ پر غلے کی بوریاں ڈھو ڈھوکر ہمارے گھر لاتا تھا اور ہمیں درہم و دینار دیا کرتا تھا۔ ہم سے وہ کہتا تھا کہ اس کی شناخت کو کبھی کسی پہ ظاہر نہ کرنا۔ 95 هجری کی تاریخ کے اس سفر میں مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اس مرتبہ میرا سفر معکوس مجھے ایک ایسی گلی میں لے جائے گا جہاں ایک مکان پر مجلس عزا برپا ہوگی ۔

ایک نوجوان آدمی اس گھر کے دروازے پر آیا اور اس نے گویا منادی کی

آج عابدوں کا چراغ بجھ گیا۔ ساجدوں کے سردار کی زندگی کی شام ہوگئی ۔ صاحب مناجات چلا گیا۔ وہ امام چلا گیا جس کی دعاؤں سے ملوکان بنوامیہ لرزاں رہا کرتے تھے۔ جس کے گریہ سے ظالم حکمران خائف رہا کرتے تھے۔ وہ جس کی خاموشی بھی صدائے احتجاج لگتی تھی ۔ جس کی بیزاری مزاحمت بن گئی تھی۔ وہ جو 61 ھجری کو 23 سال کی عمر میں واقعہ طف کے وقت خیمے میں فرش پہ بیماری کے سبب غشی کی حالت میں تھا۔ جس نے اسی بیماری کی حالت میں اپنے گھر کی عورتوں کو اسیری کے ساتھ پہلے کوفہ میں عبیداللہ بن زیاد کو للکارا اور پھر دمشق میں یزید بن معاویہ کو اپنے خطبے سے لاجواب کردیا تھا۔

میں طبقات الکبیر جس کا نگران ابن سعد زھری ہے کی تاریخ کی سرنگ سے یہ سفر کررہا تھا۔ تاریخ کی اس سرنگ سے بنوہاشم کے محلے میں، میں جب علی ابن ابي طالب کی مکان کے سامنے پہنچا تھا تو مجھےاس سرنگ کے نگران نے بتایا کہ جانے والے کی عمر 58 سال تھی۔ اس سے مجھے تاریخ کی اس سرنگ میں مزید سفر کرنا تھا اور سفر کرکے 38 ھجری کے شعبان کے مہینے میں شہر کوفہ پہنچنا تھا۔

میں 38 ھجری شعبان کے مہینے میں جب کوفہ میں علی ابن ابی طالب کے مکان کے سامنے پہنچا تو ہلال چاند کا تھوڑا سا موٹا ہوچکا تھا اور رات کو آسمان پرتارروں کا جھرمٹ تھا اور مجھے وہ سب پھیکی ، اداس مسکراہٹ لیے ہوئے نظر آرہے تھے۔ راستے میں مجھے بنوھمدان، بنو مدحج ، بنو بجیلہ ، بنو تمیم، بنو کندہ ، بنو عدی کے محلوں میں کئی گھروں سے سسکییوں اور آہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ مجھے تاریخ کے دو بڑے کوفی نگران علی ابن ابی طالب کے گھر کے سامنے ایک کونے میں کھڑے مل گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنا تعارف ابو مخنف اور دوسرے نے نصر

ان مزاحم کے طور پر کرایا تھا۔ ابو مخنف کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمک رہے تھے اور وہ مجھ سے کہنے لگا،"اوہ علی شناس! جن محلوں میں تم نے گھروں سے سسکیوں کی آوازیں سنیں ان گھروں میں اکثریت گھروں میں اب کوئی مرد نہیں بچا ہے۔ اور ان گھروں کے اکثر مرد جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں علی ابن ابی طالب کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور ان میں میرے بنو سلیم ازدی قبیلے کا جد مخنف بن سلیم بھی تھا جو صفین کے مقام پر علی ابن ابی طالب پر قربان ہوگیا۔ اور میرے کئی ازدی بزرگ جنگ نہروان میں بدو عرب خارجیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اڑتیس ھجری کا سال کوفہ کے 25 ہزار سے جنگ جوؤں کو شہادت کا جام نوش کراگیا ہے جس کی علامت یہ سسکیاں اورآہیں ہیں۔ میں نے نصر ابن مزاحم کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ علی ابن ابی طالب کے گھر کے سامنے کھڑے ہوکر ان کی اداسی میں مسکراہٹ کیوں گھلی ہوئی ہے اور کیا کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کے محلوں میں جن گھروں سے سسکیاں ابھر رہی تھیں کیا ان کے سسکیاں بھرنے والوں کے چہرے پہبھی اداسی کے رنگ میں خوشی کا رنگ ملا ہوا ہے؟ تو نصر بن مزاحم کہنے لگا ، ہاں مسکراہٹ اور تحدیث نعمت کے احساس سے بھرے ہوئے ہیں جیسے آج کا یہ چاند اور ستارے اداسی میں خوشی کی مسکراہٹ کا رنگ لیے ہوئے ہیں - میں پوچھ بیٹھا، کیوں؟

" آج علی ابن ابی طالب کے بیٹے حسین ابن علی اور ان کی بہو غزالہ کے ہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ جس کا نام علی ابن ابی طالب نے اپنے نام پر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر کو کوفہ میں شیعان علی ابن ابی طالب اپنے دکھوں کو بھول گئے ہیں اور وہ اس بات پہ نازاں ہیں کہ ان کے شہر کو یہ اعزاز حاصل ہوگیا ہے کہ آل مُحَمَّد میں سے ایک ان کے شہر میں پیدا ہوا ہے۔"

میں سوچ میں پڑگیا کہ تاریخ کی کتابوں میں علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب کو لکھنے والوں نے "الکوفی ثم المدنی" کیوں نہیں لکھا؟

ناگاہ میری نظر ابومخنف پر پڑ گئی اس نے کہا کہ جو تم سوچ رہے ہو ویسا ہمیں غیر معتبر جھوٹا ٹھہرانے کے لیے کیا گیا تھا اور کہیں علی بن حسین ابن علی ابن ابی طالب کے ساتھ "الکوفی" لکھا جاتا تو پھر "کوفي لا یعفوي" کا کلمہ عموم کیسے بولا جاتا ۔ اور پھر علی اور اس کے شعیان کے درمیان امتیاز کیسے کیا جاتا اور اس کے شیعان کوفہ کو "دغا باز" کیسے کہا جاتا؟ ہم جیسے افتادگان خاک پر تہمت بے وفائی کیسے لگائی جاتی؟ میں نے ابومخنف کے کی آواز میں اتنا درد بھرا محسوس کیا کہ مجھے لگا جیسے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

میں وہاں سے چل پڑا اور کوفہ کے بازار میں آگیا ۔ یہاں ایک دکان پر نصر بن مزاحم کا والد مزاحم بیٹھا تھا۔ اسکی ابھی مسیں بھی مشکل سے پھوٹی ہوں گی ۔ اور وہ عطار تھا اور اس وقت عطر و مشک کی شیشی و ڈبی ہر پاس سے گزرنے والے کو مفت میں بطور تحفہ دے رہا تھا۔ مجھے بھی اس نے عطر کی ایک شیشی اور مشک کی ایک ڈبیا تحفے میں دی۔ میں تھوڑا آگے بڑھا تو ایک شخص کجھور کا شربت مفت بانٹ رہا تھا۔ نصر ابن مزاحم نے مجھے کہا کہ یہ میثم تمار ہے۔ علی ابن ابی طالب کا راز داں دوست ہے ۔ بازار میں اس روز ہر چیز مفت مل رہی تھی۔ سب اداس کی چادر اوڑھے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو "مبروک" بول رہے تھے۔ مجھے لگا سب کے سب بیک وقت فرش عزا اور جشن ولادت منارہے ہیں۔ مرگ انبوہ میں جشن ولادت منانے کا یہ نئی طرز مجھے آج پتا چل رہی تھی۔ کپڑے کی

دکان پر مجھے ابوحنیفہ کے والد ثابت نظر آئے جو دراھم کی کئی تھیلیوں کا منہ کھولے آنے والوں کو بانٹتے جاتے تھے۔ میں مسجد کوفہ پہنچا تو مجھے وہاں مالک الاشتر نخعی اور حجر بن کندی ، سلیمان بن صرد، عوسجہ، شریک الاعور،کریم بن عفیف الخثمعی، عدی بن حاتم ، عبداللہ الخلیفہ الطائی سمیت کوفہ کے اہل قرا کے بڑے بڑے ناموں کو شکرانے کے نوافل ادا کرتے پایا۔ ان سب کو آنے والے دنوں میں "دین علی" سے وابستگی کی قیمت چکانا پڑے گی۔ انھوں نے دنیا پرستی کو تیاگ کر دین پرستی کو شعار بنایا تھا۔ آنے والے دنوں میں تاریخ ان کے چہروں پر "بے وفائی، غداری، دغا بازی" کی سیاسی پھینک دے گی اور صدیوں تک اس سیاہی کو ہٹاکر ان کے اصل چہرے دیکھنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کے گا ۔ یہاں تک کہ فرش عزا بچھانے اور دین علی سے وابستگی کا اعلان کرنے والے بھی ان چہروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے۔

میں نے چاہا کہ مالک الاشتر کے سجدے سے سر اٹھانے کا انتظار کروں ۔ سلام پھیرتے ہی ان کو پکاروں اور بتاؤں کہ آنے والے زمانے میں عرب کی اولین روایت تاریخ سے لیکر قرن ثامن کی کتابوں میں سے ان کو کیسے یاد کیا جائے گا۔ پھر مجھے خیال آگیا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے فوری طور پر تاریخ کے اس لمحے سے واپس حال میں بھیج دیا جائے گا۔ میں چپ کرگیا۔ میں نے دیکھا کہ مالک الاشتر شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد پاس دھری تلوار کو اٹھاکر میان میں ڈال رہا ہے اور بڑے وقار سے مسجد کے صحن سے باہر آنے کے لیے چل پڑا ہے ۔ ناگاہ میرے ذہن میں شام کے امیر کے فقرے گونجنے لگے

"ہم نے علی ابن ابی طالب کا ایک بازو (عمار) صفین میں کاٹ دیا اور دوسرا ہاتھ (مالک الاشتر) آج کٹ گیا"

نصر بن مزاحم نے پیچھے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا کہ تمہیں پتا کہ جس دن کوفہ میں مالک الاشتر کی موت کی خبر پہنچی تھی تو علی ابن ابی طالب مسم حزن وملال بن گئے تھے اور اس کے بعد یہ حزن و ملال ان کے چہرے پہ نقش ہوکر رہ گیا تھا اور اس کے بعد کسی نے انہیں ہنستے نہیں دیکھا۔

اور مجھے بے اختیار خیال آیا کہ آج علی ابن ابی طالب کے گھر جس لڑکے کی پیدائش ہوئی ہے وہ بھی ایک مدت تک مسکرائے گا نہیں – اس دن تھوڑے وقت کو مسکراہٹ اس کے چہرے پہ ابھرے گی جب مختار ثقفی قاتلان امام حسین ابن علی کے سروں کو ان کے پاس بھجوائے گا۔

وہ دو سال کا ہوا تو اسے عین فجر میں اپنے گھر میں رونے کی آوازیں سنائی دیں اور بعد میں اسے پتا چلے گا کہ وہ کون تھا جو اس دن خون میں نہایا ہوا گھر لایا گیا تھا اور کچھ دیر بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اور پھر پانچ کی سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ اس شہر میں پہنچا جسے اس کے پڑنانا کا شہر کہا جاتا تھا۔ اور پھر اسی شہر میں وہ ماں کی ممتا سے محروم ہوگیا۔ اس کی دو پھوپھیوں زینب بنت علی و ام کلثوم بنت علی نے اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر توجہ دی اور اپنی مامتا اس پہ نچھاور کی لیکن ماں کا خلا اس کے ہاں پورا ہونے کو نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے خیال کو مہمیز کو لگائی اور میں 50 ھجری سے 61 ھجری کے رجب کے مہینے تک مدینہ میں اس کے گزرے ماہ و سال کو دیکھتا رہا۔ اسے کیسا لگتا ہوگا جب وہ دیکھتا ہوگا کہ مدینہ کی اکثریت بھول کر بھی اس کے دادا کا نام زبان پر نہیں لاتی ۔ اس کی سیرت اور کردار کے روشن پہلوؤں پر کہیں اسے گفتگو ہوتی نظر نہیں آتی ۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ جمعے اور عید کے خطبات میں جن کی قرابت رسول اللہ اور سبقت اسلام کی ایک تاریخ تھی ان کا نام لیکر مذمت منبر سے کی جارہی ہے اور کوئی بولنے کو تیار نہیں ہے ۔ میں نے چشم تصور میں سعید بن زید جو بنوامیہ کے مہاجر مدنی صحابہ میں عشرہ مبشرہ میں سے تھے اس صورت حال سے تنگ آتے دیکھا جب ایک شخص مسجد نبوی میں ان کے سامنے علی ابن ابی طالب کو طنز اور بے ہودگی کے ساتھ "بوتراب "کہہ کر ان پہ سب و شتم کرتا ہے اور وہ جلال میں آکر کہتے ہیں کہ "رسول اللہ کے اس جانثار کے خلاف یہ سب کچھ ہورہا ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول نے یہ سند دی تھی کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر وہ جنت کی بشارت اپنی زندگی میں پانے والوں کےنام گنواتے ہیں اور علی ابن ابی طالب کا نام سر فہرست رکھتے ہیں اور غصے سے مسجد نبوی سے ہی چلے جاتے ہیں۔ کیا ان تک یہ بات نہ پہنچی ہوگی کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس شب وستم اور کردار کشی کی مہم کے عروج کے زمانے میں مناقب علی ابن ابی طالب کے بیان کو اپنا شعار بنالیں گے کیونکہ ان سے کوئی یہ سوال پوچھنے کی جرآت کرلے گا "مامنعک ان تسب علیا" (اے سعد! تمہیں کیا بات روکے ہوئے ہے جو تم علی ابن ابی طالب کو برا نہیں کہتے ؟)

اور وہ وقت بھی آنے والا تھا کہ جب دنیا کی محبت میں انہی سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیٹا عمرو ابن سعد حسین ابن علی کی سر کٹی لاش پر گھوڑے دوڑانے کا حکم دے گا اور خیمہ مستورات سادات اہل بیت کو آگ لگانے کا حکم دے

گا اور سب کچھ لوٹنے کا حکم دے گا۔ قاتلان اہل بیت کے لشکر کے مقتولوں کا نماز جنازہ پڑھائے گا اور یہ بات شہیدان کربلا کے لیے روا نہ رکھے گا۔

اسے ان دنوں ہر روز کوفہ اور اس کے گرد و نواح میں ایسے ہزاروں افراد کو قتل کردیے جانے کی اطلاعات موصول ہوا کریں گی جو دین علی سے وابستگی سے اعلان برات کرنے سے انکاری ہوں گے اور علی ابن ابی طالب پر سب وشتم کرنے سے انکاری ہوں گے ۔ ان میں صحابی رسول اللہ ﷺ حجر ابن عدی بھی شامل ہوں گے جنھیں ان کے ساتھیوں سمیت اس لیے ذبح کردیا جائے گا کہ وہ دین علی سے منحرف ہونے اور علی ابن ابی طالب پر سب وشتم سے انکاری تھے۔

کوفہ میں 41ھجری سے 50ھجری تک ایک لاکھ دین علی سے منحرف ہونے سے انکار اور علی ابن ابی طالب کو برا بھلا کہنے سے انکار پر قتل ہوجانے کی خبریں علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب کو ملی ہوں گی ۔ اور ان میں سے اکثریت کو علی ابن ابی طالب نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بطور پیشنگوئی بتایا تھا کہ کہ ان کے بعد ان کو انہیں برا بھلا کہنے کو کہا جائے گا تو جان بچانے کے لیے ایسا کہہ دینے پر ان پر کوئی بھار نہیں آئے گا اگر دل میں ان کے مودت ہوگی۔ امام حسن علیہ السلام نے مدینہ سے حجر ابن عدی کو صبر کرنے کا پیغام بھیجا تھا لیکن مذہب رحضت اختیار نہیں کیا اور دین علی سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہوئے جان سے گزر گئے۔

یوں 23سال کے تھے جب ان پر اصل امتحان سے گزرنے کا وقت آگیا ۔

مگر اس سے پہلے میں آگے بڑھتا، پیچھے سے کسی نے مجھے پکارا، اے علی شناس ،زرا بات سن، کوئی درویش تھا، کہنے لگا کہ میں عمرو بن حمق ہوں جسے کوفہ کے بازار میں زیاد کے ایک سپاہی نے سر پہ لاٹھی ماری تھی۔ میں وہی ہوں زیاد کو شیعان بنوامیہ نے خبر دی تھی کہ کوفہ میں عمرو بن حمق کے گھر پہ "شیعہ بوترابیہ" اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان ہر حال میں روکو۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں جنھیں تم "کوفہ کے اہل قراء" کہتے ہو۔

میں نے عمرو بن حمق کی جانب دیکھا، اس کے لمبے گھنے بال زلفوں کی صورت اس کے کاندھوں پہ لٹک رہے تھے۔ پیشانی خوب روشن تھی - چہرے پہ بھری بھری گھنی سیاہ داڑھی جو اس کے گریبان تک آ رہی تھی - کمان جیسی ابرو تھیں – ہونٹ پتلے تھے جن پہ ہلکی ترشی مونچھیں تھیں۔ ناک ستواں تھیں۔ آنکھیں گول مٹول اور پلکیں جھالربناتی تھیں اور ہلکے ہلکے سرخ ڈورے ان میں دوڑتے محسوس ہوتے تھے۔

میں نے کہا کہ تم تاریخ کے اس لمحے میں یہاں مدینہ کیا کررہے ہو؟ کہنے لگا کہ ہم جتنے دین علی کے پیرو/ شیعہ بوترابیہ کے لقب سے نوازے جانے والے رجب 60 هجری کو مدینہ آجاتے ہیں اور اپنے امام کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور کربلا تک کا سفر کرتے ہیں اور یوں ہمارا فرش عزا متحرک رہتا ہے۔

"اور مجھے تم سے ایک شکوہ کرنا ہے"، عمرو بن حمق نے اچانک سے کہا تو میں نے بے اختیار پوچھا،کون سا؟

تو وہ کہنے لگا کہ "تم نے کوفہ میں شیعان علی کی جانثاری کے واقعات میں حجر بن عدی کا اپنی گرفتاری سے پہلے بنوھمدان و مدحج،ازد، تمیم و نخعی کے محبان اہل بیعت کے گھروں میں پناہ لی اور ان گھروں میں مالک الاشتر کے بھائی عبداللہ بن حارث نخعی ، سلیم بن یزید، عمیر بن یزید کے گھرں میں ٹھہرے تھے۔ زیاد چاہتا تھا کہ کوفہ میں وہ شاطر پن اور چالاکی سے شیعان آل مُحَمَّد کی جن قبائل میں زیادہ حمایت تھی ان میں موجود شیعان بنوامیہ کی مدد سے پھوٹ ڈلوادے اور حجر کے نام پہ ان کے درمیان خانہ جنگی کرادے لیکن حجر بن عدی کی اس سازش کو ناکام بنادیا تھا۔ سلیم بن یزید نے حجر ابن عدی کو اپنے گھر ٹھہرایا تھا کہ زیاد کے سپاہی آن پہنچے تو وہ تلوار لیکر آنے والوں سے لڑنے کے لیے تنہا باہر جانے لگا اس پہ اس کی تین بیٹیاں رونے لگیں- حجر بن عدی نے سلیم بن یزید کو بہت مشکل سے روکا اور وہاں سے چلے گئے۔

حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں پہ کیا الزام لگایا گیا تھا؟ حجر بن عدی کے بارے میں زیاد نے جھوٹی شہادتوں کے ساتھ امیر شام کو خط لکھا تھا کہ وہ شیعہ بوترابیہ کا سردار ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ خلافت اور حکومت کے حقدار آل ابی طالب و فاطمہ بنت مُحَمَّد ﷺ ہیں۔ عمرو بن حمق پہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ پر نیزے کے 12 وار کرنے کا الزام عائد گیا اور اسے خالد بن ولید کے بیٹے عبدالرحمان بن ولید نے قتل کردیا تھا۔ یہ سن 51 ھجری میں ہوا تھا۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل کی روداد ہی کوفہ میں مظلوموں اور ظالموں کو الگ الگ کردیتی ہے۔ تمہارے پاس وقت نہیں تھا، کاش تم امیر شام کے مدینہ میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کے گھر آنے کے بعد حجر بن عدی و اصحاب حجر ابن عدی کے قتل بارے ان کا امیر شام سے مخاطب بات چیت کو درج کرتے تو تمہیں ام المومنین عائشہ صدیقہ اللہ تعالی عنہ کی طرف سے حجر ابن عدی اور اصحاب حجر ابن

عدی کے صاحب صدقو صفا اور اہل وفا ہونے کی گواہی ملتی اور وہ ان کے قاتلوں کے لیے تباہی کی بدعا کرتی نظرآتیں۔

اس سے تمہیں بخوبی اندازہ ہوجاتا کہ جنھیں 51ھجری کی حکومتی اسٹبلشمنٹ "شیعہ بو ترابیہ "کہہ رہی تھی اور جنھیں دین علی کے پیرو کہہ کر قتل کیا جاتا تھا وہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک عبادت گزار، نیک، پاکباز، دین دار اور دنیا پرستی سے کوسوں دور تھے -

شعبی جیسا بنوامیہ کا حامی اولین عرب روایت تاریخ بھی بھی کہنے پر مجبور ہوا کہ جب سے امام حسن علیہ السلام نے کوفہ سے مدینہ رہائش اختیار کی تھی تب سے کوفہ کا جو بھی گورنر بنتا وہ چاہے سیرت کا کتنا ہی پاکباز ہوتا وہ کچھ کام کیے بغیر نہیں رہتا تھا کیونکہ اس کے بغیر اموی سلطنت کا گورنر ممکن نہیں ہوتا تھا-"

"آؤ تمہیں بعصقب بن زھیر سے ملواتا ہوں" ، عمرو بن حمق میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک جھٹکے میں واپس کوفہ پہنچادیا اور یہاں بنو ھمدان کے حملے میں اس نے ایک گھر کے دروازے پہ دستک دی ، ایک شخص باہر نکلا اور اس نے عمرو کو کہا ابن حمق اندر چلے آؤ تمہارے وجود کسی نے نہیں دیکھنے اور وہ ہمیں دروازے سے گھر کے اندر لے آیا، وہاں صحن میں فرشی نشست بنی تھی ، ایک شخص کے گرد لوگ دائرہ بناکر بیٹھےتھے۔ عمرو بن حمق نے میرے کان میں سرگوشی کی وہ مرکز توجہ شخص عامر بن شراحیل الشعبی الھمدانی الکوفی ہے - ہم وہاں بیٹھے تھے کہ عامر الشعبی نے کہنا شروع کردیا " مغیرہ بن شعبہ جیسا والی کوفہ ہم نے اس کے بعد نہیں

پایا ، اگرچہ ان سے پہلے جو کوفہ کے والی گزرے ان میں صالح لوگ بھی تھے ، مغیرہ امیر شام کی طرف سے کوفہ کے سات سال دو مہینے گورنر رہے ۔ وہ احسن سیرت کے مالک ، عافیت پسندی سے شدید محبت کرتے تھے لیکن وہ علی (ابن ابی طالب علیہ السلام) کی اور جو ان کی حکومت میں ہوا اس کی مذمت کیا کرتے تھے--------"

ابن زھیر نے ہم سے کہ کہ کوفہ کا جو گورنر بنتا اس کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ کوفہ میں علی ابن ابی طالب کے پیروکاروں کو حقارت سے "شیعہ بو تراب" کہے اور ان پہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام لگائے۔

ہم کوفہ میں شعبی کے گھر سے باہر نکلے تو سامنے سے مجھے ابومخنف آتے ہوئے نظر آئے۔ کہنے لگے کہ " ہم کوفہ والوں پہ ظلم و زلت کے عذابوں میں اس وقت شدت آئی جب مدینہ میں امام حسن علیہ السلام شہید ہوگئے اور اس کے زیاد کا کوفہ کا گورنر بننا اور حجر بن عدی کا قتل ہوگیا۔"

عمرو بن حمق مجھے پھر کوفہ سے مدینہ لے آئے اور ہم ایک بار پھر تاریخ ھجری سال 60 میں رجب کے مہینے میں کھڑے تھے۔ عمرو بن حمق نے مجھ سے کہا کہ تمہیں اندازہ ہوا کہ 41ھجری سے 60ھجری کے درمیان کوفہ میں ہم علی ابن ابی طالب کے شعیہ کس کرب سے گزر رہے تھے ؟

ہمارے مولا کائنات علی ابن ابی طالب سمیت کبار اہل بیت اور ان کے کبار شیعوں کی قبریں پوشیدہ رکھی گئی تھیں کیونکہ اگر ان کو زیارت کے لیے عام کیا جاتا تو علی ابن ابی طالب کے دشمن ان کا نام و نشان مٹاڈالتے۔

کوفہ کی جامع مسجد میں روز ہمیں گورنر اور اس کے اہلکاروں سے علی ابن ابی طالب اور ان کی اولاد پہ سب و شتم دستور تھا۔

ہم شیعان علی ان کے پروپیگنڈے میں حضرت عثمان ابن عفان کے قاتل تھے اور ہم علی ابن ابی طالب کی پیروی کرکے گویا اسلام سے انحراف کے مرتکب ہورہے تھے۔

اور ادھر پہلے امام حسن علیہ اسلام اور ان سے ملنے والوں کی جاسوسی جاری تھی ۔ اور 56 ھجری میں امیر شام خود مدینہ تشریف لائے۔ انھوں نے سارے مدینہ کے اشراف سے ترغیب و ترھیب سے اپنے بیٹے کی ولی عہدی کی بعیت حاصل کرلی۔ بس چار افراد اس بیعت سے باہر تھے ۔ ایک حسین ابن علی ابن ابی طالب تھے۔ دوسرے عبدالرحمان بن ابی بکر تھے۔ تیسرے عبداللہ بن عمر تھے اور چوتھے عبداللہ بن عمر تھے۔ ان چاروں نے بیعت کرنے کو ایک دوسرے کی بیعت کرنے سے بطور حیلہ مشروط کیا۔ اور 60 ھجری میں امیر شام فوت ہوگئے۔ اپنے بیٹے یزید کو اس نے چاروں سے نمٹنے کے طریقے بتائے۔

میں نے دیکھا کہ عمرو بن حمق کے ساتھ کوفہ سے آنے والوں میں توابین اور مختار ثقفی کے ساتھ قاتلان شہدائے کربلا سے انتقام لینے والے بھی ایک الگ جلوس کی صورت موجود تھے اور ایسے لگتا تھا جیسے وہ سب اب اس قافلے کے ساتھ ساتھ کربلا تک چلے گئے جس کے امیر نے اپنے نانا کی قبر پہ مدینہ چھوڑنے سے پہلے شکوہ کیا تھا

کہ اہل مدینہ میں کوئی ان کے ساتھ ان کے موقف پر کھڑا ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سب ان کو مدینہ میں قیام کرنے اور یزید کو دل سے برا جانتے ہوئے اس کی دکھاوے کی بیعت کرلی جائے۔ شاید کوفہ کے کبار شیعان علی آنے والی صدیوں کے بعد سے رجب کی آخری مہینے میں اس قافلے کے ساتھ مدینہ سے شریک ہولیا کرتے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ 23 سال کے نوجوان علی بن حسین بن علی بن ابی طالب نے اس رات کیا سوچا ہوگا جب انھوں نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے والد اپنی تنہائی اور اپنے سے لوگوں کی بے گانگی کا شکوہ کرنے اپنی جائے پیدائش مدینہ میں جسے سب "نبی کا شہر" کہتے ہیں اپنے نانا کی قبر پہ پہنچے تھے۔ 60 ھجری کے اس مدینے میں حسین ابن علی ابن ابی طالب کی تسللی و تشفی اور ان کے غم بانٹنے کے لیے اب نہ انصار میں سے اتنے لوگ بچے تھے جتنے علی ابن ابی طالب کے پس تھے۔ لے دے کر خود اپنے ہی خاندان کے چند درجن افراد تھے اور باقی سب مستورات تھیں جن میں ایک ان کی بہن زینب بنت علی ابن ابی طالب تھیں جو اس سفر میں ان کے ہمراہ باعث حوصلہ و ہمت بننے والی تھیں اور خود علی بن حسین ابن علی ابن ابی طالب کو بے انتہا غم و اندوہ میں شیعان علی ابن ابی طالب کی رہنمائی کے لیے تیار کرنے والی تھیں۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے رات کی تاریکی میں حسین بن علی ابن ابی طالب کو اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ مکّہ کے راستے پر روانہ ہوتے دیکھا۔

ابو مخنف مجھے کہنے لگا کہ زرا قافلے کے قریب ہوجاؤ ، میں قریب ہوا تو میں نے دیکھا کہ امیر کارواں قران کی آیت پڑھ رہے تھے

"وہ امید وبیم کی حالت میں شہر سے نکلے اور دعا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے دے "

یہ قافلہ رجب کی 28 تاریخ 60 ھجری کی رات کو مدینہ سے مکّہ کی طرف چلا اور شعبان کی تیسری شب جمعہ کو مکّہ میں داخل ہوا۔ اور مکّہ سے اس نے آٹھ ذی الحج کو روانگی کی ۔

ابو مخنف اس دوران میرے قریب ہوگیا اور کہنے لگا کہ تمہیں خبر ہے کہ جس دوران یزید دمشق میں برسراقتدار آیا اور اس کی؛ خبر کوفہ میں شیعان علی ابن ابی طالب کو ملی تو انہوں نے اسے بہتریں موقعہ جانا کہ وہ بنوامیہ کے اقتدار سے جان چھڑالیں ۔ اس سلسلے میں کوفہ میں شیعان علی کے ممتاز لوگوں کا ایک اجلاس سیلمان بن صرد الخزاعی کے گھر میں خفیہ طور پر منعقد ہوا تھا ۔ اور وہاں پہ سب نے باہم صلاح مشورہ ہوکر یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک طرف تو اموی اقتدار کے خلاف خفیہ صف بندی کریں گے اور دوسری جانب وہ مکّہ میں تشریف فرما حسین ابن علی ابن ابی طالب کو خط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دیں گے۔ کوفہ میں صرف شیعان علی ہی نہیں بلکہ کئی ایک اشراف القبائل کے لوگ بھی تھے جنھوں نے اپنے طور پر حسین بن علی ابن ابی طالب کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ جو اشراف القبائل تھے ان کے اکثر سردار اپنی قیمت میں اضافہ کررہے تھے اور نعمان بن بشیر جو کوفہ کے گورنر تھا وہ کوفہ میں بنوامیہ کے اقتدار کو درپیش خطرے کا تدارک کرنے میں ناکام ہورہا تھا تو یزید نے عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر بناکر بھیجا۔

ابو مخنف مجھے کہنے لگا کہ سلیمان بن صرد الخزاعی کے گھر پہ جو کوفہ کے کبار شیعان علی ابن ابی طالب کا اجلاس ہوا تھا اس میں سلیمان بن صرد الخزاعی کے علاوہ مسیب بن نجبہ ، رفاعۃ بن شداد اور حبیب بن مظاہر نمایاں تھے۔ اور ان میں حبیب ابن مظاہر ہی تھے جو گرفتاری سے بچ رہے باقی سب نظر بند اور غیرمسلح کردیے گئے۔ جبکہ کئی ایک شیعان علی ابن ابی طالب مسلم بن عقیل کے ساتھ شہید ہوگئے۔

ابو مخنف کہنے لگا کہ کیا آج جو تمہیں قاتلان حسین میں موجود کوفیوں کے نام گنا تے ہیں ان میں سے کتنے نام کوفہ کے نظریہ ساز شیعان علی ابن ابی طالب کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں؟ کیا بنوامیہ کے دفاع کرنے والوں نے شیعان علی میں مالک الاشتر یا حجر ابن عدی جیسے لوگوں میں سے کسی ایک کے بیٹے یا پوتے یا پڑپوتے کا نام "غدار/دھوکہ باز کے طور پر پیش کیا؟

آل بیت کی غیر موجودگی واقعہ کربلا سے پہلے ، واقعہ کربلا کے دوران اور اس کے بعد کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب میں سے جس نے بھی تحریک کو ابھارنے اور برقرار رکھنے میں کردار ادا کیا اس کے خلاف الزام تراشیوں کی انتہا کردی گئی چاہے وہ رہنما صحابی رسول (حجر بن عدی الکندی) کیوں نہ تھا یا وہ کسی بدری صحابی کا بیٹا کیوں نہ تھا(جیسے مختار الثقفی)۔ اور کوفہ کے حضرت علی ابن ابی طالب، امام حسن، امام حسین، امام سجاد علی بن حسین، امام باقر و امام جعفر صادق آل مُحَمَّد علیھم السلام کے جتنے اصحاب تھے وہ سب کے سب غیر معتبر ٹھہرا دیے گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ ثورۃ عبداللہ بن زبیر تو بہت معتبر ٹھہرا اور ثورۃ توابین یا ثورۃ مختار الثقفی کو غیر معتبر ٹھہرادیا گیا؟

نصر ابن مزاحم مجھ سے کہنے لگا کہ کوفہ پر بنوامیہ اور بنوعباس کے مظالم کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان ہے جس کے متاثرین میں انصار و مہاجر صحابہ کرام اور ان کی اولاد بھی شامل ہے لیکن ان مظالم اور کوفہ پر شامی افواج یا عباسی افواج کی چڑھائیوں نے جو بربادی و تباہی پھیلائی اس پر ابن کثیر سے لیکر بعد میں آنے والے مورخین اور محدثین نے وہ شدید ردعمل نہیں دیا جو مدینہ پر عبداللہ ابن زبیر کے زمانے میں چڑھائی کے وقت پیش آنے والے واقعہ حرۃ پہ دیا گیا۔ کیوں؟ یہاں تو یہ سوال بھی آج تک اٹھایا نہیں جاتا۔

مختار ثقفی کی تحریک کو بدنام کرنے کے لیے ایسے راوی پیدا کیے گئے جنھوں نے خود امام علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب سے یہ جھوٹی روایت منسوب کردی کہ مختار ثقفی نے خود نبوت کا دعوا کردیا تھا۔ اور جب بس نہ چلا تو یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ اس نے مُحمؐد بن حنفیہ کے نام سے جھوٹے پروانے تشکیل دے دیے تھے۔

سلیمان بن صرد الخزاعی کے بارے میں یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ اس نے امام حسن علیہ السلام کو جنگ بند کرنے پہ "یا امام المذل المومنین "(استغفراللہ ، نعوذ باللہ من ذالک) کہہ کر مخاطب کیا اور امام حسین علیہ السلام پر بصرہ کے قریب حملہ کرنے والے خوارج کی خارجی شناخت چھپاکر انھیں بھی کوفہ کے شیعان علی میں سے قرار دینے کی سازش کی گئی۔

ابو مخنف مجھے کہنے لگا کہ ہر وہ کوفی عالم جس نے علی ابن ابی طالب کے باب میں انصاف سے کام لیا وہ اسلام دشمن قرار پایا اور جس نے بنوامیہ کا مقدمہ آگے بڑھایا اسے معتبر ہونے کی سند جاری کردی گئی ۔

اتنے میں کہیں سے امام التاریخ و الفقہ و الحدیث و التفیسر جریر طبری بھی آگئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ابو داؤد نے ان پر "شیعہ" ہونے کا الزام اس لیے صادر کیا کہ وہ مناقب علی ابن ابی طالب کی تدوین کا خصوصی اہتمام کیا کرتے تھے اور جبکہ خود ابو داؤد حنبلی بھیس میں ناصبیت کی طرف مائل تھا۔ جریر طبری کہنے لگے اگر میں اپنی تاریخ میں صرف اور صرف شعبی و زھری و سیف بن عمر، صالح بن کیسان سے روایات تاریخ درج کرتا اور علی ابن ابی طالب کے قریبی رفقا کی روایات کو چھپالیتا تو مجھے بھی بلاشک و شبہ امام اہل السنۃ و جماعۃ کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے تاریخ کی گلیوں کی یہ سیر کرانے والے میرے زریعے سے اپنا مقدمہ ہی نہیں بلکہ شیعان علی ابن ابی طالب کا مقدمہ بھی پیش کررہے تھے۔

تاریخ کے یہ کردار مجھے اپنی مرضی سے حجاز سے عراق، عراق سے حجاز لیجارہے تھے اور میں چاہتا تھا کہ جلدی جلدی ولایت تکوینی و ارضی کے تیسرے تاجدار کا قصّہ ختم کروں اور اپنے قاری سے اجازت لوں۔

اتنے میں ابو مخنف نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے ، اور کہنے لگا کہ تمہارے زمانے کی ایجاد یوٹیوب ایپ جو ہے اسے آن کرو اور مصائب آل بیت سناؤ اور جاکر سوجاؤ

میں نے تاریخ کے اس یگ میں اپنی قمیص کی جیب سے موبائل نکالا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ 60 ھجری کے آخری مہینے ذی الحج کی آٹھویں تاریخ ک مکّہ سے باہر عراق جانے والے راستے پر ایک قافلے کے پیچھے تاریخ کے کرداروں کے ساتھ کھڑے ہوئے میرے ہاتھ میں موبائل میں پورے سگنل آرہے تھے ، میں نے ڈیٹا آن کیا، یو ٹیوب ایپ آن کی اور سرچ میں "آگئی ہئے شام دی رت بابا بیمار ہاں کڑیاں پائی ویندا آں" لکھ کر انٹر پہ ٹچ کیا تو ایک دم سے حاجی اقبال مرحوم اور اس کی سنگت کا نوحہ پوری آواز سے گونجنے لگا

آگئی ہئے شام دی رت بابا بیمار ہاں کڑیاں پائی ویندا آں

میڈی اپنی قسمت امڑی دے محمل کوں ٹیک بنائی بیٹھاں آں

اٹھیں ویکھ تاں سہی کیویں سجدی ہئے میڈے سر تے پگ مظلومی دی

ہن تیڈے حکم مطابق میں امڑی کوں پگ بدھوائی بیٹھاں آں

ایتھے کیویں بھین ٹکاواں بے امن ہئے شہر دا ناں بابا

میں اپنی جھکی ہوئی کمر تلے کئے تائیں ہمشیر لکائی بیٹھاں آں

کوئی ایہی جئی لٹ پئی ہئے بابا نہ کفن رہئے نہ برقعے رہئے

نوحہ سننے والے تاریخ کے وہ کردار تھے جن پہ "شیعان بو تراب" کا لیبل لگا ہوا تھا اور ان سب میں اکثر وہ تھے جن کی گردنیں علی ابن ابی طالب اور اس کی اولاد سے وفا کرنے کے جرم میں کاٹ دی گئی تھیں ، ان کی سسکیوں کی آوازیں ویرانے میں گونج رہی تھیں ۔ درمیان کہیں کہیں "وا محمدا ، وا علیا ، وا حسینا " کی لرزتی آوازیں آرہی تھیں اور مجھے نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے زمان و مکان ، لسان و لحن کی فصیلوں کو اٹھالیا گیا ہے اور اولین تاریخ عرب کے کردار سرائیکی زبان کے اس نوحے کا ایک ایک لفظ سمجھ رہے ہوں تبھی تو کبھی "محمد عربی" کو پکارتے تھے اور کبھی "علی ابن ابی طالب "کو بلاتے تھے اور کبھی "امام علی مقام سبط رسول اللہ "کو آواز دیتے تھے-------اور میں بھی وہیں ویرانے میں بیٹھ کر سر رانوں میں دبا کر بیٹھ گیا اور سسکیاں بھرنے لگا ۔

میں رات کے کسی پہر پھر تاریخ کی گردشوں میں گھومنے نکلا اور اس موقعہ پہ مکّہ میں میرا استقبال ایک بار پھر ابو مخنف نے کیا۔ ہم دونوں وہاں سے چلے اور جہاں حسین ابن علی ابن ابی طالب ٹھہرے ہوئے تھے اس مکان میں آگئے۔ ہم نے دیکھا کہ عمر بن عبدالرحمان بن حارث مخزومی چلے آتے ہیں اور وہ حسین ابن علی ابن ابی طالب سے ملنے آرہے تھے۔ ابومخنف نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ اس کے باپ کا نام عبدالرحمان ہے اور یہ مدینہ میں بعد ازاں "فقہا سبعہ" ساتھ بڑے فقیہ مدینہ کہلانے والوں میں سے ایک ابوبکر بن عبدالرحمن کا بھائی ہے۔ اس سے روایت کرنے والوں میں عامر بن شراحیل الشعبی ، عبدالملک بن مروان بھی ہیں۔ یہ جنگ جمل میں اپنے بھائی ابوبکر کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک تھا اور دونوں بھائی بنوامیہ کی حمایت میں معروف رہے تھے۔ عمر بن عبدالرحمان امام حسین کے پاس آیا اور وہ امام حسین کو عراق کی طرف جانے سے روکنے لگا۔ اس نے مجموعی طور پر سارے اہل کوفہ کو درھم دینار کے غلام بتایا اور ساتھ ہی ان سے

کہا کہ وہ وہاں گئے تو ان کے ساتھ دھوکا ہوجائے گا۔ امام حسین نے عمر بن عبدالرحمان کے بقول ان کے مشورے کو خیر خواہی پہ مبنی قرار دیا لیکن انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ سے استخارہ کیا ہے اور میری نظر اسی پہ ہے۔ یہ وہاں سے نکلے تو عبداللہ بن عباس چلے آئے اور انہوں نے اہل عراق پر مجموعی طور پر حضرت علی ابن ابی طالب کے قتل کا الزام دھر دیا اور ان پہ عہد سے پھر جانے کا الزام عائد کیا۔ امام حسین نے ان سے کہا کہ مجھے کوفہ کے اشراف اور میرے شیعہ کے خطوط ملے ہیں۔ یہاں امام حسین نے پھر کوفہ کے اشراف القبائل اور اپنے شیعہ میں تمیز کی۔

میں نے ابو مخنف سے پوچھا کہ کیا واقعی سارے اہل کوفہ نے علی ابن ابی طالب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟

ابومخنف کہنے لگے عبداللہ بن عباس سے یہ سوال کرتے ہوئے میری تو زبان لکنت کھانے لگتی ہے کہ وہ بصرہ سے خاموشی سے مدینہ کیوں لوٹ آئے تھے جبکہ علی ابن ابی طالب کے نیچے ساٹھ ہزار کا لشکر شام پر حملہ کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔

کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب تو اس کے بعد بھی مسلسل مزاحمت کرتے رہے تھے جب حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ مدینہ میں آرام اور امن کی کی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کی زندگی کا یہ امن اور سکون پھر ان کی وفات تک قائم دائم رہا۔ اللہ ان کی قبر کو نور اور رحمت سے بھرا ہوا رکھے۔

صبح کا وقت تک امام حسین اور ان کا قافلہ مکّہ سے چلنے کو تیار ہے کہ ناگہاں یزید بن معاویہ کی طرف سے مکّہ میں مقرر گورنر اور میر حج عمرو بن سعید بن العاص

اموی اور اس کا بھائی یحیحی بن سعید بن العاص اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں آن پہنچتے ہیں اور وہ امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو زبردستی روکنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی ہے لیکن امام حسین کے انصار غالب آتے ہیں اور مکّہ سے عراق کے راستے پر چلنے لگتے ہیں ۔ یہ آٹھ ذی الحج کا دن ہے۔ اور روکنے والے امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کہتے ہیں

الا تتقی اللہ ،یا حسینا؟ اے حسین! کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟

تخرج من الجماعۃ و تفرق بین الھذہ الامۃ – جماعت سے نکلے جاتے ہو اور اس امت میں تفرقہ ڈال رہے ہو

میں وہاں کھڑا ہوا بنوامیہ کے گورنر اور مقرر کردہ امیر حج یعنی مکّہ کی اسٹبلشمنٹ سے سن رہا تھا کہ وہ سبط رسول اللہ کو گویا اللہ سے نہ ڈرنے، جماعت سے نکل جانے اور امت میں تفرقہ ڈالنے کا الزام دے رہے تھے۔

کیا یہی بات دور جدید کا نام نہاد غیر فرقہ پرست اور معتدل اصلاح پسند اسکالر ڈاکٹر جاوید غامدی نہیں کہتا؟ اسے علی ابن طالب کی حکومت کا جواز نہیں ملتا لیکن امیر شام کا مل جاتا ہے۔ وہ سیاق و سباق سے ہٹ کر یہ دیکھے بغیر کہ حسین ابن ابی طالب نہ تو اقتدار چاہتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی جنگ کا اعلان کیا تھا۔

ان کے خلاف تو یک طرفہ جنگ بنوامیہ کے بادشاہ یزید بن معاویہ نے شروع کررکھی تھی جس کی مدینہ میں اسٹبلشمنٹ نے انھیں مدینہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور جب وہ مکّہ آئے تو مکّہ میں ان کے قتل کی کوشش کی۔

مکّہ میں امام حسین علیہ السلام کن حالات سے دوچار تھے ایک طرف بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ تھی جو ان کو پکڑ کر زبردستی بیعت یا قتل کا ارادہ رکھتی تھی – دوسری طرف عبداللہ بن زبیر اور ان کے ساتھی تھے جن کے بارے میں امام حسین نے کہا

" ھا ان ھذا لیس شئی یوتاہ من الدینا احب الیہ ان اخرج من الحجاز الی العراق ، و قد علم انہ لیس لہ من الامر معي شئی ، و ان الناس لم یعدلوہ بي ،فود انی خرجت منھا لتخلو لہ"

ہائے ، اسے (عبداللہ بن زبیر) کو دنیا میں سے کوئی بھی چیز دیا جانا اتنا مرغوب نہیں ہے جتنا میرا حجاز سے نکل کر عراق جانا۔ وہ اچھے سے جانتا ہے میرے ہوئے ہوئے وہ کوئی شئے نہیں اور لوگ اسے مجھ پہ فوقیت نہیں دیں گے۔ پس اسی لیے وہ چاہت ہے کہ وہیں یہاں سے نکل جاؤں تک اس کے لیے جگہ خالی ہو۔

حضرت عبداللہ ابن عباس انھیں بنو عباس کی حمایت کا یقین دلاتے تھے اور کہتے تھے وہ حجاز میں اپنی امارت کا اعلان کردیں ۔ ان کے کچھ اصحاب تھے جب انھوں نے اصرار کیا کہ مکّہ میں ٹھہر کر وہ اپنی امارت کا اعلان کردیں۔ اس پہ سبط رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان ابتی حدثنی ان بها کبشا تستحل حرمتها ،فما احب ان اکون ذلک کبشا

میرے والد نے مجھ سے حدیث رسول اللہ بیان کی تھی کہ ایک مینڈھا اس (شہر) کی حرمت کو حلال کردے گا اور مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ وہ مینڈھا میں ٹھہرایا جاؤں ۔

کم و بیش جو صورت حال مدینہ کی تھی وہی مکّہ کی تھی ۔ اور یہاں پہ امام حسین ایک اور جملہ بھی کہا تھا

و ایم اللہ لو کنت في حجر هامة من هذه الهوام لاستخرجوني حتى يقضونى في حاجتهم، و واللہ لعتدن علي کما اعتدت اليهود في السبت

اللہ کی قسم اگر من حشرات الارض کے کسی سوراخ میں چھپ جاؤں تو بھی وہ مجھے وہاں سے نکال لیں گے اور ان کا جو مقصد ہے وہ پورا کریں گے ۔ اور اللہ کی قسم وہ مجھ پر ایسا ہی ظلم کریں گے جیسے قوم یہود یوم السبت پہ کیا کرتے تھے

میں یہ سب سوچ رہا تھا اور ابو مخنف لگتا تھا جیسے میرے خیالات پڑھ رہا ہے۔ امام حسین کے پاس مکّہ میں جو بھی آیا اس کو امام نے ایک ہی جواب دیا کہ وہ کوفہ جانا چاہتے ہیں ۔ اور امام نے اپنے ساتھیوں کو بتادیا کہ عبداللہ بن زبیر کیا چاہتا ہے۔ اور وہ اپنے دوستوں کی رائے کے مطابق مدینہ میں کیوں اعلان امارت نہیں

چاہتے؟ اس سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کو کوفہ میں اپنے شیعان کی محبت و مودت اور وفاداری پر زرا شک نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ ایک بار کوفہ داخل ہوگئے تو پھر ان کے ساتھ وہ نہیں ہوسکے گا جو بنوامیہ والے چاہتے تھے۔

کیا اتفاق ہے کہ دمشق میں بیٹھے یزید بن معاویہ اور اس کے مشیروں کی رائے بھی یہی تھی کہ کسی بھی صورت حسین ابن علی ابن ابی طالب کو کوفہ میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ اور یہی ہدایت اس نے عبید اللہ ابن زیاد کو کی، یہی ہدایت دے کر اس نے مشہور شامی سپہ سالار عمرو بن مسلم الباھلی کو اس کے لشکر کے ساتھ کوفہ میں عبیداللہ ابن زیاد کے پاس بھیجا تھا۔

حسین ابن علی اور ان کے ساتھیوں نے ظہراورعصر کی نماز مکّہ میں مسجد الحرام میں ادا کی تھی اور ظہر سے پہلے آپ نے آخری بار عبداللہ بن زبیر کی طرف سے مسجد الحرام میں قیام کی پیشکش کو رد کردیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا کہ یہاں اگر وہ کسی غار میں بھی چھپ گئے تو بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ ان کو تلاش کرلے گی اور مکّہ کی حرمت الگ برباد ہوگی ۔ آپ بعد از نماز عصر مکّہ سے اپنے ساتھیوں سمیت روانہ ہوگئے۔

امام حسین ابن علی نوشتہ دیوار صاف صاف پڑھ رہے تھے ۔ ایسا نوشتہ دیوار جسے بنوہاشم کے انتہائی سمجھ دار لوگ بھی پڑھنے سے قاصر تھے ۔ ان میں ایک عبداللہ بن جعفر طیار بھی تھے ۔ ان کی سادگی دیکھیے کہ انھوں نے ایک خط مدینہ کے اموی

والی سعید بن العاص سے لکھوایا اور ان کے بھائی کو ساتھ لیکر حضرت امام حسین کے پاس پہنچے اور انھیں یقین دلا نے کی کوشش کی کہ وہ مدینہ میں امان سے رہیں گے ۔ اس پہ امام حسین علیہ السلام نے کہا کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انھوں نے انھیں حکم کیا جس کے بعد وہ اپنا ارادہ کوفہ جانے کا نہں بدلیں گے۔ امام حسین نے نہ وہ خواب سنایا اور نہ ہی بعد ازاں کسی اور کو بتایا۔

فرزدق نے انھیں راستے میں روکنے کی کوشش کی تب بھی امام نےاپنے ارادے میں تبدیلی نہیں کی ۔ فرزدق نے کوفہ کے جو حالات بیان کیے وہ آثار سے لگتا ہے اس وقت کے حالات ہیں جب مسلم بن عقیل کی شہادت ہوچکی تھی ۔ کوفہ میں کبار شیعہ سمیت قریب قریب چار ہزار پانچ سو افراد کو گرفتار کیا جاچکا تھا۔ کئی سو افراد شہید کیے جاچکے تھے۔ شیعان علی ابن ابی طالب کے حامی قبائل کے محلوں میں رہنے والوں کو غیر مسلح کیا جاچکا تھا اور کوفہ کی ناکہ بندی کی جارہی تھی۔ ایسے میں باقی یا تو عامۃ الناس تھے جن کے دل علی ابن ابی طالب کے ساتھ تھے اور کوفہ مں اموی اسٹبلشمنٹ کے جبر کے تحت وہ خاموش تھے اور دوسری طرف اشراف القبائل کے سردار تھے جن کو جبر اور لالچ سے عبید اللہ ابن زیاد اور مسلم باھلی کی فوج نے اپنے ساتھ ملالیا تھا۔ عروہ بن ہانی کو ایک ویرانے میں قتل کیا جاتا ہے اور ان کے قبیلے مدحج کو خبر تک نہیں ملتی ۔

یہ وہ حالات تھے جن میں امام حسین ابن علی کو اموی لشکر راستے میں گھیر لیتا ہے اور پھر انھیں کوفہ کے راستے سے دوسرے راستے پر چلنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ کربلا میں ٹھہرا دیے جاتے ہیں اور پھر عمرو بن سعد اور شمر الجوشن کی قیادت میں ایک لشکر ان کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ یہ لشکر ایک ہی شرط امام حسین

ابن علی ابن ابی طالب کے سامنے رکھتا ہے کہ وہ یزید کی بیعت کریں، اس کی حکومت کو مان لیں اور اگر نہیں مانتے تو قیدی بننے یا قتل ہونے کے لیے تیار ہوجائیں ۔ امام حسین نہ تو بنا لڑے قیدی بننے پر آمادہ ہوئے اور نہ ہی انھوں نے یزید کی بیعت کی ۔

اس دوران امام حسین نے لشکر یزید کے سامنے جو بھی خطبات دیے وہ ابو مخنف نے ہمارے لیے محفوظ کرلیے ہیں۔ ان میں ہمیں کہیں یہ اشارہ تک نہیں ملتا کہ آپ اپنی امارت کا اعلان کررہے ہیں اور اپنے سامنے لشکر کو اپنی بیعت کے لیے بلارہے ہیں ۔ حر بن ریاحی آپ کو بتاتا ہے کہ ان کے ساتھ جو لشکر ہے ان میں سے کسی نے ان کو خط نہیں لکھے۔

تاریخ میں امام حسین کا ایک آخری خط ہمیں پڑھنے کے لیے ملتا ہے اور وہ ہے حبیب ابن مظاہر کے نام ۔ ہم جانتے ہیں کہ سلیمان بن صرد الخزاعی کے گھر سے کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کی طرف سے جو اجتماعی خط آپ کو ارسال کیا گیا تھا وہ چار ناموں کے ساتھ تھا جن میں سیلمان بن صرد الخزاعی، مسیب بن نجبہ الفزاری اور رفاعہ بن مشداد دیگرکبار شیعہ کے ساتھ نظر بند تھے اور حبیب بن مظاہر ہی بچے ہوئے تھے کیونکہ یہ کوفہ کے مضافات میں تھے اور اس لیے گرفتاری سے بچ گئے تھے۔ یہی حبیب ابن مظاہر بعد ازاں چھپ کر کربلا پہنچے کیونکہ ان کو ہی امام حسین کا کربلا سے لکھا گیا خط موصول ہوا تھا۔ کوفہ میں کسی کو پتا نہیں تھا کہ حسین ابن علی ابن ابی طالب کربلا میں پہنچادیے گئے ہیں۔

کربلا کا سانحہ 10محرم الحرام 61ھجری کو ہوتا ہے۔ اور 11 محرم الحرام کی صبح قافلہ حسین کے شہداء کے سر نیزوں پر اٹھائے اور عورتوں اور ایک تنہا بیمار نوجوان امام سجاد کو پابہ زنجیر کرکے کوفہ کی طرف لیجایا جاتا ہے۔ اور یہ قافلہ قرین قیاس ہے کہ 13 یا 14محرم الحرام کو کوفہ پہنچتا ہے اور وہیں عبیداللہ ابن زیاد کے دربار میں حاضری ہوتی ہے۔ دو دن بعد اس قافلے کو دمشق کے لیے روانہ کردیا جاتا ہے۔

دمشق میں یزید زینب بنت علی ابن ابی طالب اور علی بن حسین ابن ابی طالب کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی وجہ وہ سب اقدامات تھے جو علی ابن ابی طالب نے اٹھائے تھے۔ ادھر عبدالملک بن مروان عبید اللہ ابن زیاد کے حکم سے مدینہ جاتا ہے اور وہاں کے حاکم سعید بن العاص کو قتل حسین کی خبر خوشخبری کے طور پر سناتا ہے۔ اور جب بنو ہاشم کے گھر کی عورتیں قتل حسین ابن علی پر نوحہ کرتیں ہیں تو انھیں کہا جاتا ہے کہ یہ نوحہ ویسا ہی ہے جیسا نوعہ و مرثیہ قریش کی بوڑھی عورتیں جنگ بدر و احد و خندق میں مارے جانے والے مکّی قریش سرداروں کے لیے پڑھا کرتی تھیں یا جیسے بنوامیہ کی عورتوں نے شہادت عثمان ابن عفان پر پڑھا تھا۔

ہمس ایسی روایات ملتی ہیں جن میں یزید بنوامیہ کو حکومت ملنے اور آل مُحَمَّد کی شکست کو قرآن کی آیت سے اللہ کا حکم اور اس کی منشا بتاتا ہے۔ یزید اور دیگر بنوامیہ کے اقوال اس موقعہ پر پڑھ کر صاف لگتے ہیں کہ وہ سرے سے علی ابن ابی طالب کی حکومت کے انعقاد کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور حضرت علی ابن ابی طالب کو قتل عثمان کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے ۔ وہ حضرت علی ابن ابی طالب ، امام حسن اور امام حسین کو پیش آنے والی مشکلات و مضائب اور ان پہ ہونے الے مظالم کو (معاذ

اللہ) اللہ کی طرف سے مسلط ذلت خیال کرتے تھے۔ اور آنے والے دنوں میں یہی بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ کا پروپیگنڈا ہونا تھا ۔

ہمیں ان اولین کرداروں کی تلاش کرنا ہوگی جنھوں نے ابتدائی عرب روایت تاریخ میں پہلے پہل یہ کلیشے بنایا کہ علی ابن ابی طالب کی حکومت کے خاتمے، امام حسین علیہ السلام کی صلح اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت ان کے کوفہ میں ساتھیوں اور شیعوں کی بے وفائی، بزدلی اور غداری کا نتیجہ تھی ۔

حجاز میں جب حسین ابن علی اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی خبر پہنچی تو طبری میں ہمیں عبدالملک بن نوفل سے یہ روایت ملتی ہے

لما قتل حسین علیہ السلام قام ابن الزبیر في اهل مکۃ ،عظم مقتلہ ، و عاب علی الکوفۃ خاصۃ و الام لااهل العراق

جب حسین ابن علی علیہ السلام شہید کردیے گئے تو عبداللہ بن زبیر اہل مکّہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور ان کے قتال کی خوب تعریف کی ۔ خصوصی طور پر اہل کوفہ کی اور عمومی طور پر اہل عراق کی شدید مذمت کی ۔

ابن زبیر نے کہا

ان اہل العراق غدر فجر الا قلیلا ، و ان الکوفۃ شرار اهل العراق ، و انهم دعوا حسینا لینصروا و یولوہ علیهم ، فلما قدم علیهم ثارو الیہ،

بے شک اہل عراق کی اکثریت نے غداری کی اور چند ہی تھے جو ایسے نہ تھے۔ اہل عراق میں سب سے شریر ترین اہل کوفہ ہیں ۔ انھوں نے حسین کو بلایا کہ ان کی امداد کریں گے اور ان کو اپنا حاکم بنائیں گے اور جب وہ وہاں گئے تو ان کے خلاف لڑنے کھڑے ہوگئے۔

ابن زبیر کا یہ بیانیہ وہ بیانیہ ہے جسے بعد ازاں نہ صرف خود کو اہل سنت و جماعۃ کہلانے والوں کی اکثریت نے اختیار کرلیا بلکہ اسے خود کو شیعہ امامیہ کہلانے والوں نے بھی اختیار کرلیا۔

بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ میں ہم نے یہ دیکھا کہ ان کے جو شامی اولین راویان تاریخ تھے انھوں نے جیسے علی ابن ابی طالب کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات کو اول اول عمرو بن عاص پر ڈالا۔ اور انھوں نے ایسے ہی حسین ابن علی ابن ابی طالب کے قتل کا الزام یزید اور بنوا میہ سے ہٹاکر کر اسے عبید اللہ ابن زیاد اور شمر الجوشن تک محدود رکھنے کی کوشش کی ۔ اگرچہ مدینہ و مکّہ میں جو بنوامیہ کے اشراف تھے انھوں نے کسی حد تک ان واقعات کو عثمان ابن عفان کی شہادت کے ساتھ جوڑ کر دیکھا اور کئی ایک نے اسے اسلامی غزوات میں قریش مکّہ کو ہونے والے جانی و مالی نقصان کے تناظر میں اسے دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ۔ لیکن عبدالملک بن مروان کے زمانے سے بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ کے ابتدائی راویوں نے پھر ان سب واقعات کا ذمہ دار خصوصی طور پرشیعان علی ابن ابی طالب کو ٹھہرادیا۔ اس طرح سے ایک عام بیانیہ یہی بنا کہ آل مُحمّد سے دھوکہ جو ہوا وہ ان کے محبوں اور پیروکاروں نے کیا۔

ابن زبیر کے اس خطاب میں چند جملے اور بھی ہیں

فرای و انہ و اصحابہ قلیل في کثیر، و ان کان اللہ لم یطلع علی الغیب احدا انہ مقتول

حسین ابن علی اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ وہ اور ان کے اصحاب اقلیت میں ہیں ان کی کثرت کے مقابل اور اللہ اپنے غیب کو تو کسی پر مطلع نہیں کرتا ، اسی لیے وہ قتل ہوگئے۔

دیکھا جائے تو عبداللہ بن زبیر یہاں پر امام حسین علیہ السلام کی بصیرت اور دور اندیشی کا رد کررہے ہیں کہ ایک تو انھیں اپنے اصحاب اور پیروکاروں کے حوالے سے جو کوفہ میں تھے بڑی غلط فہمی تھی اور غیب کا علم ان کے پاس تھا نہیں تو وہ اسی لیے قتل ہوگئے۔

عبداللہ ابن زبیر کی اس رائے کے برخلاف سینکڑوں شواہد موجود ہیں کہ امام حسین کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ کوفہ میں پہنچ گئے تو ان کے پیروکارون کے ساتھ مل کر وہ اپنے آپ کو محفوظ کرلیں گے ۔ لیکن امام حسین کو یہ بات بھی اچھے سے معلوم تھی اور اس کا اظہار بھی کیا کہ اگر وہ نہ پہنچ سکے تو پھر شہادت ان کا مقدر ہے۔ اور کربلا کے میدان میں سامنے کھڑے یزیدی لشکر کے عزائم کے بارے میں وہ اچھے سے جانتے تھے اور وہ کربلا میں محصور ہونے کے ساتھ ہی یہ بات بھی جان گئے تھے کہ اب وہ موقعہ آن پہنچا ہے جس بارے انھوں نے اپنے نانا اور اپنے والد سے کافی کچھ سنا تھا اور وہ تھی ان کی اپنی شہادت کی خبر۔

ہمیں اس قافلے میں بچ جانے والے امام سجاد علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کے منہ سے یہ کلمہ کبھی سننے کو نہیں ملا کہ ان کے والد نے اپنی حالت کا ذمہ دار ان کبار شیعہ میں سے کسی ایک کا نام لیکر ٹھہرایا ہو جن کے نام خط میں لکھے ہوئے تھے۔

عبداللہ بن زبیر کو اچھے سے پتا تھا کہ عراق اور کوفہ کے شیعان علی ان کی امارت پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ ان کے بارے میں امام حسین علیہ السلام نے جو فرمایا تھا وہ میں اوپر درج کرچکا ۔ اب وہ امام حسین علیہ السلام کے قتل کے نام پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے ۔ وہ عراق پر اسی صورت حملہ کرسکتے تھے جب وہ عراق میں آل محمدؐ کے پیروکاروں اور دوسرے معنوں میں شیعی سیاسی-سماجی تحریک کو مسترد کردیں اور وہاں کے کبار شیعان علی کو غیر معتبر بتلائیں۔

امام سجاد علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب جب مدینہ تشریف لائے تو وہ 63 ھجری میں انھوں نے اپنے آپ کو بنوامیہ اور آل زبیر کے درمیان حجاز کی حکومت پر ہونے والے جھگڑے سے الگ رکھا اور مدینہ کے نواحی علاقے میں آگئے۔

61ھجری سے لیکر 73 ھجری یعنی 12 سالوں کے دوران بنوامیہ اور آل زبیر کے درمیان لڑائی جاری رہی ۔ اور اس دوران کہیں بھی امن نہیں تھا۔ امام سجاد علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب نے ابتدائی چھے سال تو ویرانے میں گزارے ۔ واقعہ حرہ کے بعد ان کا خاندان مدینہ میں آباد ہوگیا اور آپ بالوں کا ایک خیمہ لگاکر مدینہ سے باہر رہتے یا پھر جنت البقیع کے قبرستان میں اپنی دادی ، چچا کی قبروں کے پاس

خیمہ لگا لیتے۔ یہاں پر آپ مصروف عبادت رہا کرتے یا پھر گریہ وزاری کیا کرتے۔ آپ بہت کم مسجد نبوی میں تشریف لایا کرتے تھے اور اس وقت تک باقاعدہ آپ کا مسجد نبوی میں درس دیے جانے کا زکر نہیں ملتا۔ اس دوران اس بات کا ثبوت بھی نہیں ملتا کہ آپ نے کبھی مدینہ سے باہر عراق کا سفر کیا ہو۔

قتل امام حسین علیہ السلام کے بعد ہمیں کوفہ کے کبار شیعان علی کی چار سال تک کی سرگرمیوں کا پتا نہیں چلتا۔ ہمیں ان کے بارے میں پہلی خبر اس وقت ملتی ہے جب 65ھجری میں عبیداللہ ابن زیاد جو ہے اپنے لشکر کو لیکر کوفہ سے دور النخیلہ میں لیکر چلا جاتا ہے۔ اور اس وقت کچھ عرصے کے لیے کوفہ میں شیعان علی پر سختیاں کم ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی سپیس جیسے ہی ملتی ہے ویسے ہی کوفہ کے شیعان علی میں سب سے بزرگ شخصیت جو صحابی رسول اللہ بھی ہیں وہ سلیمان بن صرد الخزاعی کی شخصیت ہے۔

سلیمان بن صرد الخزاعی 28 قبل ھجری میں پیدا ہوئے تھے – ان کو طبقات الکبیر کے مصنف مُحَمَّد بن سعد نے طبقہ ثالثہ کے ایسے مہاجر عرب صحابہ میں شمار کیا ہے جنھوں نے غزوہ خندق میں شرکت کی تھی – غزوہ خندق 5 ھجری میں ہوئی تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلیمان بن صرد الخزاعی 5ھجری سے قبل مسلمان ہوچکے تھے۔ ابن سعد ان کو اپنے قبیلے کے ایک ممتاز شخص کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی صحبت کا زمانہ کم از کم 8 سال بنتا ہے۔ ان کے بارے میں سب مورخین کا یہ اتفاق ہے کہ یہ کوفہ میں آباد ہونے والے اولین صحابہ کرام میں سے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان تین سو جید صحابہ کرام میں شامل تھے جنھیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاکر آباد ہونے کو کہا تھا۔ حیرت انگیز طور

پر ان کی جو حجاز کی زندگی کے اس کی تفصیلات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کوفہ میں یہ اصحاب قرا میں شمار ہوا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ان مہاجر صحابہ میں سے ایک تھے جنھیں قرآن کریم مکمل طور پر حفظ تھا اور ان کے ذمہ قرآن پاک کی تعلیم بھی تھی۔

کوفہ میں ان کا تعلق عبداللہ بن مسعود، سعد بن ابی وقاص ، حذیفہ الیمان ، عمار یاسر جیسے جید صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ان کے ساتھیوں میں کوفہ میں آباد کندہ قبیلے کے ایک اور جید صحابی رسول حجر بن عدی سے تھا۔ اگر ہم کوفہ میں شیعان علی کی علم و دانش کی تربیت کا اولین فریضہ دیکھنا چاہیں تو وہ عمار یاسر، عبداللہ بن مسعود اور حذیفہ الیمان کے سر لگتا ہے۔ اور حذیفہ الیمان کو ہم کوفہ سمیت عراق میں زھد و اتقا اور اولین صوفیانہ عرفان کے بیج بونے والا کہہ سکتے ہیں۔ انہی کے نقش قدم پر حجر بن عدی ، مالک الاشتر چلے۔

اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس صحابی رسول نے تیسری یا چوتھی صدی ھجری میں اسلام قبول کیا ہو اور وہ آٹھ یا سات سال صحبت رسول اللہ سے مستفید ہوا تو کیا وہ حضرت علی ابن ابی طالب کی صحبت سے مستفید نہ ہوا ہوگا۔ یقینی بات ہے ہوا ہوگا- اس لیے جب علی ابن ابی طالب خلیفہ بنے اور جنگ جمل میں لشکر لیکر آئے تو سلیمان بن صرد الخزاعی ان پہلے سات ہزار پانچ سو کوفی لشکریوں میں شامل تھے جو کوفہ سے امام حسن، عمار یاسر، حجر الکندی اور مالک الاشتر کی سعی سے علی ابن ابی طالب کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ سلیمان بن صرد خزاعی اس کے بعد ہمیں صفین و نھروان کی جنگ میں بھی شامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ صلح امام حسین کے زمانے سے لیکر 65 ھجری تک ہمیں فعال نظر آتے ہیں۔

کوفہ میں جو صحابی رسول اہل قرا کے نام سے مشہور تھے ان میں یہ واحد صحابی رسول اللہ ﷺ تھے جو 56 ھجری کے بعد کوفہ میں رہے اور ان کا تعلق حضرت علی ابن ابی طالب کی جماعت سے تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں ایک اور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کوفہ میں تھے جو شیعان علی ابن ابی طالب میں سے تھے اور وہ تھے عدی بن حاتم الطائی ۔ یہ قتل حسین سے قبل ہی یمن کی پہاڑیوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ چلے گئے تھے۔

سلیمان بن صرد خزاعی کو عدی بن حاتم پر سبقت اسلام بھی حاصل تھی اور اس وجہ سے یہ کوفہ کے شیعان علی کے قائد بھی ٹھہرے۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو 56ھجری میں حجر بن عدی کی وفات کے بعد کے بعد کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کی قیادت سلیمان بن صرد الخزاعی ہی کررہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اہم اجلاس ان کے گھر ممنعقد ہوا کرتا تھا۔ امیر شام کی وفات کے بعد امام حسین علیہ السلام کو کوفہ آنے کی دعوت دینے کا اجلاس بھی ان کے گھر منعقد ہوا تھا اور ان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے 64 ھجری میں جو اجلاس منعقد ہوا وہ بھی سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر منعقد ہوا تھا۔

ترانوے سال ان کی عمر ہوچکی تھی ۔ اس پیرانہ سالی میں بھی ان کے جذبے جوان تھے ۔ سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی ۔

ان کے ساتھ اجلاس میں شریک ہونے والے مسیّب بن نجبۃ الفزاری تھے۔ یہ قادسیہ کی اولین جنگوں میں شامل تھے اور کوفہ میں اولین بس جانے والوں میں یہ شامل تھے۔ انھوں نے لامحالہ سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، حذیفۃ بن یمان ، عمار یاسر جیسے صحابہ کرام کی صحبت اٹھائی تھی اور یہ جنگ جمل و صفین و نہروان میں علی ابن ابی طالب کے ساتھ تھے۔ سلیمان بن صرد الخزاعی کے بعد کبار کوفی شیعہ میں ان کا نام آتا ہے۔ یہ بھی پیرانہ سالی میں تھے – ان کی عمر 82 سال تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے زمانہ رسول اللہ دیکھا تھا اگرچہ رویت النبی ثابت نہیں ہے۔

تیسرے بزرگ اس اجلاس میں جو شریک تھے وہ رفاعہ بن شداد تھے ۔ رفاعہ بن شداد قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس میں حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھیوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی ۔ یہ بھی کوفہ کے طبقہ ثالثہ میں شمار ہوتے ہیں اور تابعی اہل قرا تھے۔ یہ اہل الارض السواد تھے جن کے بارے میں ابن سعد نے طبقات الکبیر میں کوفہ کے فضائل کے بیان میں یہ بات درج کی کہ اہل الارض اسواد کے جو عالم تھے ان سے زیادہ علم و فضل اور تقوی میں کوئی نہیں تھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ جمل، جنگ صفین اور نہروان میں شریک رہے۔ یہ مالک الاشتر کے قریبی رفقا میں سے تھے اور مالک الاشتر ربذہ کے صحرا میں جن ساتھیوں کے ساتھ حضرت ابو زر غفاری رضی اللہ عنہ سے ملے تھے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ ولید بن عقبہ اور سعید بن عاص کوفہ میں اموی گورنروں کے خلاف اہل قرا نے جو تحریک کھڑی کی تھی یہ اس میں شامل تھے۔ ان کو جنگ صفین میں حضرت علی نے قبیلہ بجیلہ سے شریک جنگ لوگوں کے دستے کی قیادت سونپی تھی ۔ اور حضرت علی نے ان کو جو نصائح فرمائے ان کو انھوں نے اپنے شاگردوں کو بیان کیا تھا۔ جب حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف زیاد بن ابی سفیان نے آپریشن شروع کیا تو یہ عمرو بن حمق کے ساتھ جزیرہ کی طرف چلے گئے تھے جہاں عمرو بن حمق

عبدالرحمان بن خالد بن ولید کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قتل ہوئے تھے۔ یہ بچ گئے تھے۔ اور امیر شام کی وفات پر یہ واپس کوفہ چلے آئے تھے۔ ان کا نام بھی حسین ابن علی ابن ابی طالب کو مکّہ ارسال کیے گئے خط میں شامل تھا۔

چوتھے بزرگ عبداللہ بن سعد الازدی تھے۔ قبیلہ ازد بھی کوفہ کے اولین قدیم آباد ہونے والے قبیلوں میں سے تھا۔ یہ جنگ صفین سے حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھ شامل ہوئے اور پھر ان کی جماعت کے ہورہے۔

پانچویں بزرگ عبداللہ بن وائل التمیمی الکوفی بھی کوفہ کے قدیم شہریوں میں سے تھے ۔ یہ بھی حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ ان کا تعلق بھی کوفہ کے قراء سے تھا ۔ شاعر تھے، بہت بڑے عابد اور صالح شخص تھے۔

یہ پانچ بزرگ تھے جو اپنی زندگی شام کرنے والے تھے اور ان کے ساتھ کوفہ میں دیگر بااعتماد شیعان علی ابن ابی طالب بھی سلیمان بن صرد الخزاعی کے ہاں ہونے والے اجلاس میں شریک ہوئے۔

میں سوچ رہا تھا کہ عبیداللہ ابن زیاد کے گورنری کے دوران کوفہ کے شیعان علی بدترین ظلم و ستم سے گزرے تھے اور یہ پانچ کبار شیعہ تو اذیتوں کے ایک نہ ختم ہونے والے دور سے گزر چکے تھے لیکن جیسے ہی عبیداللہ ابن زیاد کوفہ سے تھوڑی دور نخیلہ کے مقام پر اپنی فوج لیکر جاتا ہے یہ پھر متحرک ہوگئے اور انھوں نے پھر لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسے جانبازوں اور جانثاروں کو دھوکہ باز، دغا باز، شرار اہل

العراق جیسے لقب دینا کیا ٹھیک ہے؟ یہ جب بھی اکٹھے ہوئے ان کا مقصد "دین علی ابن ابی طالب" کو ہی رائج کرنا تھا جو دین محمؐد / دین اسلام کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔

طبری نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے کہ 61ھجری کے بعد جیسے ہی کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کو موقعہ ملا انھوں نے خفیہ اجلاس کرنے شروع کردیے تھے۔ اور 65 ھجری میں ان کا اعلانیہ اجلاس سلیمان بن صرد الخزاعی کے گھر پر منعقد ہوا۔

اور طبری کے مطابق کل 110 افراد تھے جو اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ سلیمان بن صرد الخزاعی کا جو خطبہ طبری نے درج کیا ہے اس میں سلیمان بن صرد الخزاعی کے مطابق وہ جن افراد سے مخاطب تھے ان سب کی عمریں ساٹھ سال سے اوپر تھیں ۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس اجلاس میں زیادہ تعداد میں ایسے لوگ شریک ہوئے تھے جو حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھ اگر جنگ جمل میں شریک نہ بھی ہوئے ہوں تو وہ جنگ صفین، نہروان میں لازمی شریک ہوئے ہوں گے اور انھوں نے اہل شام کی غارات کا مقابلہ بھی کیا ہوگا۔ یہ اجلاس کوفہ کے شیوخ کبار شیعیان علی ابن ابی طالب کا نمائندہ اجلاس تھا۔

طبری ہمیں شیعان علی ابن ابی طالب کے ایک اور مرکز کا پتا بھی دیتا ہے۔ اور یہ مرکز تھا مدائن جہاں پر حذیفہ الیمان صحابی رسول اللہ ﷺ کے بیٹے سعد بن حذیفہ یمان کی حکومت تھی ۔ حذیفہ بن یمان حضرت علی ابن ابی طالب کے مقرب دوست اصحاب رسول میں تھے ۔

ابن سعد نے طبقات الکبیر میں "الطبقات الکوفیین" میں جن صحابہ کرام کا کوفہ میں آباد ہونے کا زکر کیا ہے ان میں قریب قریب 37 ایسے جید صحابہ کرام کا زکر کیا ہے جو جو فتح مکّہ سے قبل ایمان لائے تھے اور انھوں نے حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھ جنگ جمل، صفین و نہروان میں شرکت کی ۔ ان 37 صحابہ کرام کی اکثریت وہ تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق کی فتوحات میں شریک ہوئے اور کوفہ کو اپنا مسکن بنالیا۔ ان میں دس میں سات وہ صحابہ کرام بھی شامل ہیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار یاسر کے ساتھ کوفہ روانہ کیا تھا اور یہ ساتھ صحابہ کرام بھی حضرت علی ابن ابی طالب کے کوفی شیعان علی ابن ابی طالب میں شمار ہوتے ہیں۔

جن صحابہ کرام کو طبقات الکبیر میں ابن سعد نے کوفی شیعان علی ابن ابی طالب میں شمار کیا ان میں سے ایک بھی قریشی مکّی اشراف ، قریشی مہاجر مدنی اشراف میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی وہ اشراف القبائل کوفہ میں شامل تھا۔

مدینہ میں سے تعلق رکھنے والے جن صحابہ کرام کو ابن سعد کوفہ میں بس جانے والے شیعان علی ابن ابی طالب میں سے قرار دیتا ہے ان میں سب سے زیادہ تعداد انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق رکھتی ہے اور پھر قبیلہ خزرج انصار سے تعلق رکھتی ہے۔ تیسرے نمبر پر مدینہ میں ازاد کردہ غلاموں کی ہے اور چوتھے نمبر پہ حجاز کے ایسے قبائل سے ہے جو کسی طاقتور قبیلے کے حلیف تھے۔ ہم قرآن کی اپنی اصطلاح میں انھیں مستضفعین الارض قرار دے سکتے ہیں۔ اگر ہو جدید سماجی طبقاتی مقام کے اعتبار سے بات کریں تو ان کا تعلق ایک تو نہایت ہی غریب کسان پرتوں سے تھا یا پھر وہ مزارع تھے یا پھر وہ نچلے درجے کے سپاہیوں میں تھے۔

ابن سعد اور دگر مورخین کے ہاں شیعان عل ابن ابی طالب جو کوفہ کے ابتدائی قدیم باشندوں میں سے تھے اور وہ مرتبہ صحابیت کو نہیں پہنچے۔ اسلامی اصطلاح میں ان کو تابعین کہا گیا ان میں ایک بڑی تعداد کوفہ کے بازار میں چھوٹی موٹی دکانداروں کی تھی جنھیں ان نصر، ابو مخنف ، طبری و البلازری "بازار والے" کہتا ہے ۔ ان میں عطر بیچنے والے، کپڑا فروخت کرنے والے، گھوڑوں، اونٹوں اور گدھوں کی چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والے، مٹھائی کا کاروبار کرنے والے تھے۔ آپ کے شیعہ میں شمار ہونے والے کوفیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسے کاشتکاروں کی تھی جو کوفہ کے گرد و نواح میں خراجی زمینوں کی کاشت کیا کرتی تھی جن کو سواد الارض کہا جاتا ہے۔

ابن سعد طبقات کوفہ کے آغاز میں کوفہ کی فضیلت بیان کرنے والے اقوال درج کرتے ہوئے اہل السواد کا تذکرہ بھی لیکر آیا ہے۔ اور ایک روایت میں وہ کہتا ہے " قوم السواد سے زیاد علم رکھنے والی، فقیہ اور سب سے زیادہ جرآت رکھنے والی کوفہ میں کوئی اور قوم نہیں دیکھی"

اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے کہ کوفہ میں جو شیعان علی ابن ابی طالب تھے ان کا مذہبی اعتبار سے رتبہ نہایت بلند تھا ۔ اخلاقی پاکبازی میں بھی ان کی ہمسری کوئی نہیں کرتا تھا ۔ ایسے ہی سماجی- معاشی اعتبار سے ہم ان کو اس زمانے کی حکمران اشراف طبقات میں شامل نہیں کرسکتے تھے۔

اگر ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ یعنی پہلی صدی ھجری کا سماجی طبقاتی گروہ بندی کے نکتہ نظر سے جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس گروہ بندی کے آثار حضرت عمر

ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے آخری تین سالوں میں صاف صاف ابھرتے نظر آتے ہیں۔

اگر ہم فتح مکّہ کے بعد مدینہ اور مکّہ کی سماجی زندگی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں مدینہ میں ایک طرف انصار تھے جن کی بھاری اکثریت کاشتکاری سے منسلک تھی اور ان میں باغات میں کام کرنے والے کھیت مزدور بھی تھے۔ اور اسی طرح برتن سازی کرنے والے، مدینہ کو پانی فراہم کرنے والے، چھوٹی موٹی دکانداری سے منسلک اور تجارتی قافلوں کے ساتھ بطور لوڈر، ان لوڈر شامل ہونے والے بھی تھے۔ جبکہ دوسری طرف مہاجروں میں ایک طرف تجارت سے منسلک لوگ تھے جن میں بڑے تاجر جو تھے ان کا تعلق بنوامیہ سے تھا اور بنوہاشم میں ہمیں آل عباس سے تعلق رکھنے والے چند ایک اصحاب تھے جو بڑی تجارت سے منسلک تھے۔ بنوامیہ میں حضرت عثمان بن عفان بہت بڑے تاجر تھے تھے جن کی تجارت حجاز سے باہر شام تک تھی ۔ پھر عبدالرحمان بن عوف تھے جن کی تجارت مدینہ و اس کے کرد و نراح میں تھی۔ لیکن ان کا مقابلہ مکّہ کی قریشی اشراف تاجر برادری سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ابوسفیان جو سب سے بڑا قریشی مکّی اشرافی تاجر تھا اس کی تجارت کا دائرہ کار حجاز، عراق، شام اور اس سے آگے روم تک پھیلا ہوا تھا۔ اور شام میں اس کے دادا کے زمانے سے تجارتی حویلیاں شام میں قائم تھیں۔ یہ بات بعید ہی نہیں ہے کہ اس کے تجارتی روابط ان عرب تاجروں سے بھی ہوں جو سمندر کے راستے اپنا تجارتی مال گجرات، کاٹھیا وارڈ ، سراندیپ(سری لنکا)، سندھ اور مکران تک لیجایا کرتے تھے۔

فتح مکّہ کے بعد اس مکّی قریشی اشراف تاجر طبقے کے روابط مدنی مہاجر قریشی طبقے سے بحال ہوئے۔ خاص طور پر مکّی قریشی بنوامیہ جو تھے ان کے مدنی مہاجر

بنوامیہ اشراف سے روابط دوبارہ بحال ہوئے۔ خود حضور علیہ الصلوات والتسلیم کی حیات میں ہی ابو سفیان کے جو بڑے بیٹے تھے یزید بن ابی سفیان وہ اکثر شام میں ہی حویلی میں مقیم تھے اور تجارتی مفادات کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام کی فتح کے ساتھ ہی یہی یزید بن ابو سفیان شام کے گورنر بنے اور یہ سریانی زبان سے بھی اچھے سے واقف تھے۔

حضرت عمر کے زمانے میں ہونے والی فتوحات اور بلاد اسلامیہ کی وسعت میں اضافے نے قریشی مکّی اشرافیہ کی تجارت میں اور وسیت پیدا کی۔ ان کا پہلے سے موجود تجارتی نیٹ ورک اور مضبوط اور وسیع ہوا۔ عبدالرحمان بن عوف، سعید بن عاص، سعید بن زید سمیت قریشی مہاجر اموی مدنی تاجر اشرافیہ اور مکّہ کی اموی قریشی تاجر اشرافیہ کے درمیان لازمی مشترکہ تجارتی وینچر بھی وجود میں آئے ہوں گے۔ زبیر بن عوام اور حضرت طلحہ بھی مدینہ کے ابھرتے ہوئے تاجر مہاجر قریشی اشرافیہ میں سے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہونے والی فتوحات اور اس سے ملنے والے مال غنمیت کا ایک بڑا حصّہ کوفہ میں بس جانے والے اشراف القبائل کو پہنچا۔ ان کی سماجی حالت میں بھی بدلاؤ آیا۔

حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں حکم بن العاص اور مروان بن العاص کو مدینہ مین واپس بلایا اور انھوں نے آخری چھے سالوں میں تمام بلاد اسلامیہ میں اموی قریش اشراف کو گورنر بنادیا تھا۔ ان کے دور میں جو زرعی

زمینیں اور مال غنیمت آتا آتا تھا ان کا زیادہ حصّہ بھی اموی اشراف میں بٹنے لگا تھا ۔ فتوحات سے پیدا ہونے والے معاشی موقعوں سے سب سے زیادہ فائدہ پرانی قریشی مکّی اشرافیہ کو پہنچا تھا ۔

ولید بن عقبۃ کی گورنری کے زمانے میں اشراف القبائل کوفہ اور بنوامیہ کے قریشی مکّی اور مدنی مہاجر اشراف سے تعلقات استوار ہوئے ۔ اور ہم نے ان روابط کو سعید بن عاص کی گورنری کے زمانے مینبھی ترقی کرتے پایا اور ابو موسی اشعری کے زمانہ گورنری میں بھی یہ رو بہ ترقی دیکھے۔

حضرت عثمان ابن ابی عفان کے زمانے میں جو بلاد اسلامیہ کی اسٹبلشمنٹ تھی اس میں اموی اشرافیہ کا زور بڑھنے سے عرب مرکنٹائل اشرافیہ میں اموی مرکنٹائل اشرافیہ اور طاقتور ہوتے چلے گئے۔ شام میں اموی مرکنٹائل کلاس کو شامی اسٹبلشمنٹ کی پوری طرح سے مدد حاصل تھی ۔ وہاں ایک بہت بڑی فوج اموی مرکنٹائل اشرافی سیکشن کی بے پناہ ترقی میں اہم کردار ادا کررہا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر، عراق اور حجاز میں جو مال الفئے اس میں عراق اور مصر کی خراجی زمینیں اور وہاں کی سابقہ بادشاہتوں کی ملکیتی زرعی زمینوں کا جو انتظام و انصرام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اس میں بدلاؤ لانے کی کوشش کی ۔ عراق کی سواد الارض زرعی زمینوں کا جو اسٹیس اس میں بدلاؤ کی یہ کوشش مدنی اور مکّی قریشی اموی مرکنٹائل سیکشن کو ان زمینوں کا مالک بنانے کی کوشش بھی شامل تھی ۔ اس کوشش نے عراق کے سواد الارض

زمینوں کے کاشتکار طبقے میں زبردست بے چینی پیدا کی۔ اور یہی سماجی بے چینی ہمیں مصر میں بھی نظر آئی۔

مدینہ میں جو غیر اموی مہاجر مرکنٹائل اشرافیہ تھی جن کے سب سے بڑے علمبردار حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بن عوام تھے ان کو ایسے لگا کہ وہ عراق کی اراضی سواد سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردیے گئے ہیں ۔ ادھر عرب کے اشراف القبائل میں اشعث بن قیس جیسے سردار بھی اس محرومی کا شکار خود کو سمجھ رہے تھے۔ بصرہ اور نئے فتح ہونے والے علاقے آزر بائجان کی زمینوں میں اشعث بن قیس اور زیاد بن ابی سفیان جیسے اپنے حصّے کے طالب تھے۔ انھوں نے بھی اس سماجی بے چینی کا حصّہ بننے میں دیر نہ لگائی ۔

مدینہ میں جو انصار اور مہاجر صحابہ کرام اور ان کی اولاد جو مرکنٹائل اشرافیہ میں شمار نہیں ہوتے تھے ان کے ہاں جو بے چینی تھی وہ مرکنٹائل اور زمیندار اشرافیہ میں شامل ہونے کی نہیں تھی ۔ ایسے ہی کوفہ میں جو غیر اشراف تھے جن کی قیادت کوفہ کے اصحاب قرا کررہے تھے ان کی جدوجہد کا مقصد بھی مرکنٹائل اشرافیہ اور زمیندار اشرافیہ میں شامل ہونا نہیں تھا۔ یہ طبقات حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورکے سماجی نظم و ضبط کی بحالی کے حامی تھے ۔ اور مذہبی اعتبار سے یہ حضرت عثمان ابن عفان کی اسٹبلشمنٹ کے عہدے داروں میں دینداری، زہد و اتقا اور سادہ طرز زندگی کے احیا کا مطالبہ بھی کررہے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ حضرت عثمان ابن عفان السابقون الاولون من المہاجرین و الانصار سے جن گورنروں اور بیت المال کے عمال کو معزول کیا تھا ان کو دوبارہ بحال کیا جائے۔

ہمیں تاریخ میں ابو زرغفاری ایک ایسی شخصیت نظر آتے ہیں جو مکّہ کی قریشی اشرافیہ / مرکنٹائل اشرافیہ کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ خود مدینہ میں مہاجر مرکنٹائل اشرافیہ کی بھی سخت مخالفت کرتے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے ایسے مہاجر اور انصاری مدنی صحابہ کرام کی بھی سخت گوشمالی کی جنھوں نے بلاداسلامیہ کی گورنری یا بیت المال کے انچارج بننے کے دوران کافی دولت جمع کرلی تھی ۔ وہ کوفہ میں ولید بن عقبہ اور شام میں معاویہ ان ابی سفیان کو مال و دولت جمع کرنے پر سخت وعید سناتے نظر آتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ہم انھیں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمان بن عوف اور ابی بن کعب انصاری سے سخت جھگڑا کرتے نظر آئے۔ کوفہ اور شام میں ہم نے ان کو باقاعدہ مہم چلاتے دیکھا۔ جب وہ معاویہ ابن ابی سفیان کی شکایت پر مدینہ واپس بلائے گئے تو انہوں نے مدینہ میں اپنی مہم جاری رکھی۔ یہاں تک کہ حضرت ثمان ابن عفان نے انھیں ربذہ کے صحرا میں جلاوطن کرنے کا حکم صادر کردیا۔

اسی زمانے میں ہم عبداللہ بن مسعود کو حضرت سعد بن ابی وقاص گورنر کوفہ کے ساتھ بیت المال سے لی گئی ایک خطیر رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتے دیکھتے ہیں ۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو حضرت عثمان ابن ابی عفان بدل ڈالتے ہیں اور ولید بن عقبہ کو گورنر کوفہ بناکر بھیجتے ہیں جن سے عبداللہ بن مسعود کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور عبداللہ بن مسعود کو حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالی عنہ واپس بلاتے ہیں اور کوفہ کا بیت المال بھی ولید بن عقبہ کے حوالے کردتے ہیں۔ اس سے کوفہ میں جو اہل قرا ہیں وہ ولید بن عقبہ کے شدید مخالف ہوجاتے ہیں اور پھر نماز فجر میں ولید بن عقبہ پر نشے کی حالت میں دو کی بجائے چار رکعات پڑھانے والا واقعہ پیش آتا ہے جس سے مدینہ اور کوفہ میں شدید احتجاج اٹھتا ہے تو ان کو سعید بن العاص سے بدل دیا جاتا ہے۔ لیکن کوفہ میں ان کے خلاف اٹھنے والی تحریک کم

ہونے کی بجائے اور شدید ہوجاتی ہے۔ کوفہ میں اس تحریک کی سربراہی عمار بن یاسر سنبھال لیتے ہیں جن کو حضرت عثمان کوفہ سے مدینہ واپس بلالیتے ہیں تو ان کے خلاف اس تحریک کی سربراہی عدی بن حاتم، حجر بن عدی ، سلیمان بن صرد خزاعی جیسوں کے ہاتھ آجاتی ہے۔

ولید بن عقبہ اور اس کے بعد سعید بن العاص دونوں کوفہ میں پیدا ہونے والی سماجی تحریک کے سرکردہ افراد کے بارے میں حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کو جو خطوط لکھتے ہیں ان خطوط میں ان کو جہاں اصحاب قرا لکھا جاتا ہے وہیں ان کے سماجی اور قبائلی کم تر رتبے کا بار بار زکر کیا جاتا ہے اور اس کا حقارت سے زکر کیا جاتا ہے۔ جبکہ مدینہ کی مرکنٹائل مہاجر اشرافیہ سے ہٹ کر جو دوسرے مہاجر و انصار صحابہ کرام ہوتے ہیں ان کے ہاں کوفہ کے ان اہل قرا خاص طور پر حجر بن عدی، سلیمان بن صرد الخزاعی ، عدی بن حاتم اور دیگر کا بڑی عزت اور احترام سے تذکرہ ملتا ہے۔ یہ مہاجر و انصار صحابہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کو کوفہ کے ان اصحاب کی شکایات پر غور کرنے اور ان کا مداوا کرنے پر زور دیتے نظر آتے ہیں ۔ یہاں تک کہ حضرت علی ابن ابی طالب بھی حضرت عثمان ابن عفان کو اصلاح احوال کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔

مدینہ میں مہاجرین اور انصار صحابہ کرام میں یہ تاثر بھی زور پکڑتا جاتا ہے کہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے نام سے جو اقدامات اٹھائے جارہے ہیں ان کا صادر کرنے والا ان کا سیکرٹری مروان ہے ناکہ خود حضرت عثمان ابن عفان۔

مہاجرین و انصار صحابہ جو مدینہ میں مقیم تھے ان کے اندر یہ سوچ بھی گہری ہوتی جاتی تھی کہ مرکز خلافت میں مہاجرین و انصار صحابہ کی صورت جو شورائیت کا

مرکز تھا اسے غیر اہم اور غیر موثر بنادیا گیا ہے اور اہم مدنی مہاجروں میں اموی اشراف اور مکّہ کے قریشی اموی اشراف ہوگئے ہیں۔ یہ سوچ خود پہلے دو خلفائے راشدین کی اولاد میں بھی راسخ ہوتی نظر آرہی تھی۔

ھجری 23ویں سال کے آخر اور پورے 24ویں سال ھجری میں شام کو چھوڑ کر مصر، عراق اور حجاز میں زبردست سماجی- سیاسی تقسیم ہوئی اور یہ باقاعدہ پرتشدد تصادم کی صورت اختیار کرگئی ۔ 23ویں سال ھجری کے حج کے موقعہ پر امیر شام مدینہ آتے ہیں اور وہ حضرت عثمان ابن عفان کو شام سے فوجی مدد کی پیشکش کرتے ہیں اور حضرت عثمان کو ان کے خلاف کھڑی ہونے والی مخالفت کو طاقت سے کچل دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ اس مشورے کو رد کردیتے ہیں۔

اس ساری تفصیل کو یہاں بیان کرنے کا مقصد پہلی صدی ھجری کی تاریخ اسلامی کی سماجی بنیادوں اور حالات و واقعات کے تحت جنم لینے والی سماجی-معاشی گروہ بندی اور اس بنیاد پر تشکیل پانے والے سیاسی بیانیوں کی تفہیم کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ میں نے اوپر جو مرکنٹائل کلاس کی اصطلاح استعمال کی ہے وہ بہت ڈھیلے ڈھالے معنوں میں ہے ناکہ اس سے عین وہ معنی مراد ہے جو مغرب میں جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف سفر کے دوران پیدا ہونے والی کلاس تھی۔

اس سماجی تقسیم کا بیان اس لیے بھی ضروری ہے کہ نوآبادیاتی دور میں ہمارے ہاں اسلامی نشاۃ ثانیہ ، اسلامی اصلاح پسندوں نے نوآبادیاتی قبضے اور غلامی کے

سدباب کے لیے جب مسلم تاریخ کی پہلی صدی ھجری کے اسلامی سماجوں کی تاریخ کی طرف رجوع کیا تو ان کی اکثریت نے پہلی صدی ھجری میں حضرت عثمان ابن عفان کے دور سے لیکر چھوتھے خلیفہ کے قتل تک کے دور کا سرے سے کوئی سماجی تجزیہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اس پورے دورانیہ کے تاریخی مجموعے سے انہوں نے صرف نظر کیا۔ اور اسلامی تاریخ کا انہوں نے ایک تصوراتی منظر نامہ تشکیل دیا۔ اور انہوں نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے ہر مسلمان گروہ کو اس کی نسلی- ثقافتی شناخت سے الگ کرکے اسلام اور مسلمانوں کے ایک ہیرو اور سورما کی شکل دے دی۔ ایسے افریقہ، اسپین ، مشرقی یورپ پر حملہ آور فاتح جیسے مسلم بن قتیبہ تھا یا موسی بن نصیر تھا یا محمؐد بن قاسم تھا یا یوسف تاشفین تھا ، محمود غزنوی تھا، شہاب الدین غوری تھا، صلاح الدین ایوبی تھا یا کوئی اور تھا یہ سب کے سب ہندوستانی مسلمانوں کے ہیرو قرار پائے۔ یہ کن حکومتوں کے ترجمان تھے اور کن حکمران طبقات کے نمائندہ تھے اس بات سے صرف نظر کرلی گئی ۔

سید قطب اور مولانا مودودی جن کے ہاں مسلمانوں میں نسلیاتی- ثقافتی اور سماجی- معاشی بنیادوں سے جنم لینے والی کسی تقسیم کا تصور بھی کفر تھا انہوں نے پہلی صدی ھجری کے 23ویں سال سے شروع ہونے والی تقسیم کو خلاف و ملوکیت کی سادہ تقسیم کے زریعے سے اپنے زمانے کی حسیت اور عصریت کو اس تاریخ پر چسپاں کرکے اپنے ہی مطالب اور مفاہیم نکالنے شروع کردیے۔

ان کے مقابلے میں جو تاریخ کا مادی تصور لیکر میدان میں آئے تو انہوں نے اس تاریخ کا سنجیدگی خود تاریخ کے جدلیاتی مادی تصور کے تحت مطالعہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ ابتدائی مسلم تاریخ میں سوشلسٹ خیالات کی تلاش کرنے والوں نے بہت ہی عجیب

رویہ اختیار کیا۔ انھوں اشخاص میں تو سوشلسٹ خیالات کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن سماجی گروہی تقسیم مں اس کی تلاش میں ان کی سانس پھول گئی ۔ مثال کے طور پر مفتی شفیع کی کتاب " اسلام کا زرعی نظام اراضی" ، جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری کی کتاب " اسلام کے معاشی تصورات" ، ڈاکٹر یوسف گورایہ کی کتاب " اسلام میں کرایہ داری کا تصور" ، مولانا طاسین کی کتاب " اسلام اور جاگیرداری" جیسی ابتدائی کتابوں کا جائزہ لیں تو انھوں نے حضرت ابوبکر، حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہما کے ایک دو معروف اقوال کا تذکرہ کیا اور لیکن ان میں سے کسی نے بھی پہلی صدی ھجری میں فتوحات کے بعد اور اس سے پہلے حجاز، عراق(میسوپوٹیما)، شام، روم ، ایران میں سماجی طبقات کے ابھار اور ان کے درمیان کشاکش کا کوئی سنجیدہ مطالعہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ۔

دوسری طرف اسلامی سوشلزم کے مدمقابل اسلامی معاشی نظام کی سرمایہ دارانہ تعبیر کرنے والے نوآبادیات اور مابعد نوآبادیات دانشوروں جس میں سرفہرست سید ابوالاعلی مودودی تھے انھوں نے بھی ابتدائی اسلام کی تاریخ کی سماجی بنیادوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

میں نے دیکھا ہے کہ ایک طرف دیوبند مدرسہ تحریک سے متاثر مصلحین اور ماہرین تاریخ نے اس دور کو فرقہ وارانہ تعصبات کے تحت دیکھا تو دوسری جانب خود کو فرقہ واریت سے ماورا بتانے والوں نے اس دور کی پیچیدگیوں کو اپنے تصوراتی سنہری دور سے متصادم پاکر اس تاریخ کو عجمی سازش قرار دے ڈالا۔ کہیں کہیں مجھے لگتا ہے کہ یہ سارے لوگ اصطلاح " شیعان علی ابن ابی طالب" سے ایسے وحشت زدہ ہوئے کہ اس کی گہرائی میں جاکر دیکھنے کی کوشش نہیں کی ۔

اگرچہ لیفٹ کی مارکسی – لیننی تصور تاریخ کے جنوبی ایشیائی لکھاریوں نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے پرآشوب دور پر باقاعدہ کوئی تھیسس نہیں لکھا لیکن اکثر ان کے ہاں اس دور کی تاریخ کو تاریخ کے میکانکی مادیت پسندی کے نکتہ نظر سے دیکھا اور اسے مغرب کی تاریخ کے قبیل داری سے غلام داری اور غلام داری سے جاگیرداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری میں بدلنے کو استعمال میں لاتے ہوئے انھوں نے یہ تشریح کرنے کی کوشش کی چونکہ علی ابن ابی طالب اور ان کی جماعت سماج کے قبائلی جمہوریت پسندانہ طرز کو برقرار رکھنے کی کوشش کررہے تھے جبکہ سماج ابتدائی قبیل داری سے غلام داری جاگیرداری سماج میں بدلنے جارہا تھا تو اس سے مطابقت رکھنے والے اموی کامیاب ہوگئے اور انہوں نے اسے تاریخ کا ترقی پسندانہ اقدام بھی قرار دے ڈالا۔ یہ میکانکی مادی مارکسی تصور تاریخ ہیومن ایجنسی کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہے جس کی طرف انھوں نے نگاہ ہی نہیں کی۔

یہی پاکستانی مارکس وادی اور پاکستانی لبرل پاکستان میں سپاہ صحابہ اور طالبان کے ابھار کی سماجی مادی تاریخ کی بنیاد پر تجزیہ کرتے ہوئے ان کی دیہی سماجی بنیادوں کا خام تجزیہ کرتے ہوئے اسے پنجاب کے جاگیرداروں اور خیبر پختون خوا کے خوانین کے خلاف ردعمل قرار دیتے نہیں تھکتے لیکن ان کے پاس اس بات کا جواب نہیں ہوتا کہ سپاہ صحابہ نے پنجاب کے غیر شیعہ جاگیرداروں اور طالبان نے غیر شیعہ خوانین کے خلاف وہ تباہ کن کردار نہ اپنایا جو انہوں نے شیعہ جاگیرداروں اور شیعہ پختون خوانین کے خلاف اپنانے کا دعوا کیا تھا حالانکہ زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ ان دونوں کا سماج کی جاگیرداری باقیات کے خلاف لڑنے کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

یہ پاکستانی مارکس وادی ایسا کوئی تجزیہ کوفہ کی شیعان ابن ابی طالب ، خوارج ، شیعان عثمان و شیعان معاویہ بن ابی سفیان بارے پیش نہ کرسکے۔

علی ابن ابی طالب کی خلافت بارے مدینہ،مکّہ، کوفہ، بصرہ ،مصر اور شام میں جو ردعمل سامنے آئے مگ وہ اس زمانے کی سماجی تقسیم کے تابع تھے۔

مدینہ میں جو اموی مہاجر اشرافیہ تھی اس نے مکّہ کی قریشی عرب اشرافیہ کے ساتھ اتحاد بنایا اور اس خلافت کو چیلنج کردیا ۔ جبکہ اموی مہاجر اشرافیہ سے ہٹ کر جو مہاجر مدنی اشرافیہ تھی ان میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر جیسے لوگ تھے جو حضرت عثمان بن عفان کی جگہ لینے کے خواہش مند تھے انہوں نے حضرت علی کی خلافت کو اپنے سماجی مفاد کے مخالف پایا اور وہ بھی وقتی طور پر اس خلافت کے خلاف پرانی عرب قریشی اشرافیہ کے اتحادی ہوگئے۔ مدینہ میں متوسط طبقے کی تاجر پرت جن کی نمائندگی حضرت عبداللہ بن عمر کرتے تھے یا حضرت سعد بن ابی وقاص کرتے تھے یا ایسے ہی چند ایک تھے ان کو اس تصادم سے گریز اپنے مفاد کے مطابق معلوم ہورہا تھا تو انہوں نے اس سے گریزپائی کا راستا اختیار کیا۔ اسی میں ایسی پرت بھی تھی جو حضرت علی ابن ابی طالب کو پرانی مکّی قریشی اشرافیہ اور شام میں بنوامیہ کی اشرافیہ کے درمیان مصالحت میں اپنا مفاد دیکھ رہی تھی تو اس نے یہ کوشش کرکے دیکھی ان میں مغیرہ بن شعبہ جیسے لوگ نمایاں تھے۔ آل عباس اور بنو ہاشم میں بھی ایسی درمیانی پرت تھی حضرت علی ابن ابی طالب کی خلافت میں اپنے لے مواقع دیکھ رہی تھی ۔ کیا عجب بات ہے کہ ابن عباس علی ابن ابی طالب کو دیے گئے مغیرہ بن شعبہ کے مشورے پر عمل کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ہماری یہ حیرانی اس وقت دور ہوجانی چاہئیے جب ہم مکّہ کی پرانی عرب قریشی اشرافیہ میں حضرت

عباس کو بھی پاتے ہیں اور ان کے ایک بیٹے عبید اللہ بن عباس کو بعد ازاں معاویہ ابن ابی سفیان کے پاس دمشق میں دیکھتے ہیں۔ حضرت علی ابن ابی طالب پرانی مکّی قریش اشرافیہ اور بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ کے کرداروں کو کوئی ر،عایت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ مدینہ و مکّہ ،شام سمیت جہاں جہآں اموی اسٹبلشمنٹ کے مقرر کردہ گورنر اور دیگر سرکاری عہدے دار ہوتے ہیں ان سب کو ان کے عہدے سے ہٹانے کا فرمان جاری کردتے ہیں ۔ اور مدینہ کی غیر اشراف انصاری و مہاجر پرتوں اور کوفہ میں وہ اہل سواد، اہل قراء اور غیر اشراف عرب قبائل سے تعلق رکھنے والوں میں سے اپنی حکومت کے عہدے دار چنتے ہیں اور ان ہی کو اپنے شیعہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ اشعث بن قیس اور زیاد بن ابی سفیان کو اپنے ساتھ ہونے اور کوفہ کے اشراف القبائل میں سے اپنی حمایت کو آنے والوں کو "ہمارے شیعہ" نہیں کہتے۔ وہ یہ الفاظ کوفہ کے گرد و نواح میں بسنے والے اپنے حامی عرب بدؤ قبائل کی اپنی حمایت کے باوجود ان کو اپنے شیعہ کا لقب نہیں دیتے۔

حضرت علی ابن ابی طالب کا خود اپنےحامیوں کے اندر "اپنے شیعہ "کو دوسرے حامیوں سے ممتاز کرنا ان کی سوچ کی غمازی کرتا ہے۔

اور یہی کوفہ کے شیعان علی ابن طالب ہوتے ہیں جو جنگ صفین میں تحکیم کے دو اجلاسوں میں آپ ہی کا دفاع کرتے ہیں اور شامی کیمپ اور خوارج کے کیمپ کی کے ساتھ نہیں جاتے۔ اور پھر نھروان کی جنگ میں خارجیوں سے صف آرا ہوتے ہیں ۔ شام والوں کی مسلط کردہ غارات کا خاتمہ بھی یہی شیعان علی ابن ابی طالب کرتے ہیں۔

اموی اشراف جو اس زمانے کے حکمران شراف طبقات میں سب سے زیادہ متحد گروہ ہوتے ہیں، وہ بھی کوفہ کے دیگر سماجی گروہوں سے "شیعان علی ابن ابی طالب "کو "شیعہ بوتراب" کہہ کر الگ کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال بھی ان کو ہمیشہ گھیرے رہتا ہے کہ یہ لالچ کے آگے تو سرنگوں نہیں ہوں گے - ان سے جبر و تشدد کی زبان سے نمٹنا پڑے گا۔ اور امیر شام سے لیکر اخری اموی بادشاہ ہشام بن عبدالملک تک وہ "شیعان علی ابن ابی طالب" کو ریاستی مشینری کے جبر سے کچلنے کو ہی واحد سٹرٹیجی خیال کرتے ہیں۔

میں نے آل زبیر کے سربراہ عبداللہ ابن زبیر کا رویہ حضرت علی کے کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کے بارے میں قتل حسین کی خبر مکّہ پہنچنے پر اہل مکّہ سے ان کے خطاب کے زریعے واضح کرچکا ہوں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب" کی کردار کشی عرب کے اشراف طبقات کیوں کررہے تھے؟ اس کی ایک بہت بڑی بنیادی وجہ کوفہ کے شیعان ابی طالب کی سماجی بنیادوں میں چھپی ہوئی تھی -

ایک چیز جو ہمیں مدینہ کے غیر اشراف مہاجر اور انصار صحابہ کرام جو حضرت علی ابن ابی طالب اور کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب میں مشترکہ ملتی ہے وہ ان کا حضرت علی ابن ابی طالب کے بارے میں مذہبی بیانیہ تھا۔ حضرت علی ابن ابی طالب کے حامیوں میں جن ابتدائی جلیل القدر صحابیوں کا ذکر ہمیں تاریخ میں ملتا ہے ان میں بہت اہم حضرت سلیمان فارسی، زید بن ارقم، مقداد، برا بن عازب،عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، ابو زر غفاری، ابو ایوب انصاری، ابو قتادہ، حذیفہ بن یمان، عدی بن حاتم، عثمان بن مظعون، سہیل بن حنیف، حجر بن عدی، سلیمان بن صرد

خزاعی (میں اس لسٹ میں اور اضافہ بھی کرسکتا ہوں) شامل ہیں اور یہ سب وہ ہیں جو غدیرخم کے مقام پر حضرت علی ابن ابی طالب کی منصب ولایت پر فائز ہونے کی روایت بیان کرتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں ایسے صحابی اور تابعین ہیں جو علی ابن ابی طالب کے فضائل دیگر کا ان صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت علی ، فاطمہ اور حسن و حسین کا پیغمر کی چادر میں چھپنا اور مباہلہ کے موقعہ پر بھی ان چاروں کو لیکر جانا یہ بھی ان شیعان علی ابن ابی طالب کے لیے ان کا ایک خاص مقام ہونے کا عقیدہ بناتا ہے۔ یہ شیعان علی ابن ابی طالب کا چاہے وہ صحابی تھے یا تابعی تھے یا تبع تابعین تھے کی طرف سے ایک ایسا مذہبی بیانیہ تشکیل دیتا ہے جس کی سب سے زیادہ تردید کرنے کی ضرورت اموی حکمران اشرافیہ کو پیش آتی ہے۔

شیعان ابی طالب کئی بار اشعار میں اور اشعار کے بغیر اپنے آپ کو "دین علی " پر بتاتے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے مخالف بھی جب ان کو قتل کرتے ہیں تو وہ مقتولین کو "علی دین علی " بتاتے ہیں۔ یہ وہ مذہبی بیانیہ ہے جو شیعان علی ابن ابی طالب اپنا شعار بنالیتے ہیں اور ان کے مخالفین بھی ان کو اسی شعار پر ہونے والے بتاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب شام کی طرف قتل حسین کا بدلہ لینے نکلتے ہیں تو شامی لشکر ان کو عین الوردہ کے مقام پر آلیتا ہے جنگ ہوتی ہے تو ہم سلیمان بن صرد خزاعی ایسے رجز پڑھتے سنتے ہیں جس میں وہ اپنا تعارف یوں کراتے ہیں،"میں سلیمان بن صرد خزاعی ہوں جو دین علی پر ہے" ، یہی بات ہم مسیب بن نجبۃ الفزاری، رفاعۃ بن شداد اور دیگر لوگوں کہتے سنتے ہیں۔

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی ابن ابی طالب کے حامی صحابہ کرام اور ان کے حواری جو پہلی صدی ھجری میں تھے حضرت علی کے موقف کے تو حامی تھے لیکن ان کے ہاں علی ابن ابی طالب کی کوئی لیجنڈری ، دیو مالائی، عرفانی، روحانی تجسیم نہ تھی وہ اوپر بیان کیے گئے شیعان علی ابن ابی طالب کے مذہبی بیانیہ کو بغفور ملاحظہ کرلیں۔

میں حیران ہوں کہ ابتدائی اسلام کی تاریخ پر کام کرنے والے انتہائی اعتدال پسند مشتشرقین جیسے ایلرنگ لڈوگ پیٹرسن ہیں وہ اولین عرب روایت تاریخ میں ابتدائی شیعان علی ابن ابی طالب کے ہاں علی ابن ابی طالب اور دیگر اہل بیت بارے عرفانی، روحانی ، لیجنڈری، دیومالائی مذہبی بیانیہ نہیں پاتے۔ جبکہ اولین عرب روایت تاریخ میں ہمیں اس کے درجنوں شواہد مل رہے ہیں۔ اور شیعان علی ابن ابی طالب کو ان کے دوسرے معاصر سماجی گروہوں سے یہی مذہبی بیانیہ تو الگ کرتا ہے۔ شیعان ابن ابی طالب کا مذہبی بیانیہ ان کو یہ بات ماننے کی طرف لیجاتا ہے کہ ان کا حضرت علی ابن ابی طالب کے ساتھ جڑنا اور ان کی پیروی کرنا صرف اس وقت پیش نظر مسآئل میں ان کے موقف اور رائے کے درست ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ پیروی مذہبی فریضہ بھی ہے جس پر عمل آخرت میں نجات کی کنجی ہے۔

بنوامیہ شیعان علی ابن ابی طالب و اہل بیت کی تقدیس پر مبنی مذہبی بیانیہ کی تردید میں پوری قوت سے مشغول رہے۔ انہوں نے اس کے مدمقابل علی ابن ابی طالب اور اہل بیت پہ سب و شتم کا بیانیہ اپنایا۔ علی ابن ابی طالب کا جو سبقت اسلام و قرابت رسول اللہ کا رشتہ تھا اور ان کے دیگر اصحاب کرام سے جو باتیں وجہ امتیاز

بنتی تھیں ان کا انکار کرنے کی کوشش ہوئی یا اس امتیاز کو کمتر بنانے کی کوشش کی یا اس کی برابری کسی اور طرح سے کرنے کی کوشش سے کی۔

اس کے ساتھ ساتھ بنوامیہ نے خود اپنے بارے میں بھی جعلی فضائل گھڑنے کی فیکٹری لگائی ۔ حالانکہ اس کوشش کو خود مہاجر و انصار صحابہ کرام میں سے ایسوں نے بھی ناکام بنایا جو حضرت علی ابن ابی طالب کی خلافت کے زمانے میں ہونے والی جنگوں میں غیر جانبدار پوزیشن کے حامل رہے تھے یا جنگ جمل میں ان کے مقابل آگئے تھے۔

ان میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالی عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ اس سے کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کے سماجی- سیاسی بیانیہ کے ساتھ ان کے مذہبی بیانیہ کو بھی بہت زیادہ تقویت ملی ۔

کوفہ کے کبار شیعان علی ابن ابی طالب کی سچ بیانی ، زھد و اتقا اور پاکبازی کی گواہی ہمیں اس وقت بھی ملتی ہے جب حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل کیے جانے کی خبر مدینہ پہنچتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ ساتھ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو کوفہ کے سب سے زیادہ سچے ، پاکباز، عبادت کزار صالحین قرار دیتی ہیں اور وہ حجر بن عدی کی وفات پر مرثیہ اشعار بھی پڑھتی ہیں۔

میں تاریخ کی گہرائیوں میں جتنا اترتا جاتا ہوں میرے سامنے یہ بات عیاں ہوتی جاتی ہے کہ شیعان علی ابن ابی طالب کا سامنا ایک طرف تو دینا پرستوں، جاہ پرستوں، طاقت و اقتدار کے پچاریوں اور عیش و عشرت میں مست رہنے والوں سے تھا اور دوسری طرف ان کا سامنا "عافیت کوشوں" سے تھا ۔ ان دو جہتوں کے عین درمیان میں وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ انھیں اپنی تاریخ بھی خود رقم کرنا تھی اور اپنی تاریخ کو گم کردیے جانے سے بچانا بھی تھا۔ ان کی اصل شناخت کو بار بار گم کردیا جاتا تھا۔ شواہد چھپا لیے جاتے، ثبوت غائب کردیے جاتے تھے۔ ان کے گواہوں کو جھوٹا ، بے امان قرار دیا جاتا تھا صرف اس وجہ سے کہ وہ حضرت علی اور اہل بیت کی مدح خوانی کیا کرتے تھے۔ ایک وقت تو وہ آیا کہ جب امام شافعی کو مدحت آل رسول اور مدحت علی ابن ابی طالب کرنے پر "رافضی" ٹھہرایا گیا۔
حالانکہ نہ اس وقت بنوامیہ رہے تھے نہ ان کی حکومت رہی تھی۔ امام نسائی حضرت علی ابن ابی طالب کی شان میں وارد احادیث کا مجموعہ لانے کی بنا پر رافضی ٹھہرائے گئے۔

یہاں میں ایک دلچسپ مگر ستم ظریف واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ امام نسائی ہمارے اہل سنت و جماعۃ کی احادیث کی چھے اصح کتب احادیث میں سے ایک کتاب "سنن نسائی " کے مولف ہیں اور ظاہر ہے بڑے عالم جرح و تعدیل بھی ہیں۔ انھوں نے فضائل علی ابن ابی طالب میں وارد درجنوں احادیث کی اسناد کو صحیح اور کئی ایک کو ضعیف لکھا۔ یہ احادیث ایسی تھیں جن کے صحیح درجے سے ضعیف درجے پر اور ضعیف درجے سے موضوع درجے پر لانے والے متاخرین جرح و تعدیل ان اسناد کے راویوں میں کسی راوی کے بارے میں اولین اصحاب جرح و تعدیل کی رائے "في تشیع" ، " شیعي" آنے کو 'رافضي" اور "في رفض" کے مماثل لے آئے تھے ۔ جیسے ابن تیمیہ نے حضرت علی کے فضائل میں آنے والی ساری احادیث میں سے تین یا چار

کے سوا سب کو من گھڑت قرار دے ڈالا۔ حدیث من کنت مولاہ کو موضوع روایت اور تمام اسناد کو جھوٹا قرار دے دیا۔ اب ان متاخرین جرح و تعدیل میں سے کچھ نے یہ کہا کہ نسائی ضعیف حدیث کو صحیح اور موضوع حدیث کو ضعیف قرار دینے کی اکثر غلطی کرتے ہیں ۔ مستدرک کے مولف حاکم نیشاپوری کے بارے میں یہ بات گھڑی کہ آخری عمر میں ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا اور فضائل علی ابن ابی طالب پر ان کی زکر کردہ سب احادیث موضوع ہیں۔ مسند امام احمد میں وارد فضائل علی ابن ابی طالب احادیث کی اکثریت کو بعد میں داخل کیا جانا بتادیا۔ تو جب بعد والوں کا یہ حال کیا گیا تو پہلی صدی ھجری کے کوفہ کے شیعان علی ابن ابی طالب کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا۔

کراچی میں میرے ایک دوست ہیں انتصار تقوی ، وہ زمانہ طالب علمی میں ترقی پسند طلبا تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں ہوا کرتے تھے۔ اب وہ پیشہ تدریس سے منسلک ہیں ۔ انھوں نے ابتدائی اسلامی تاریخ کے سماجی مطالعے کے دوران میری تحقیق کے حوالے سے کہا کہ "آپ نے درست کہا ہے کہ مولانا مودودی اور مفتی مُحَمَّد شفیع سماجی علوم میں جدید تحقیقی میتھڈولوجی سے واقف نہیں تھے۔(بعد میں آنے والے اکثر اہل علم کا بھی یہی حال ہے) ان کے عقائد ، مذہبی مقام اور مقاصد بھی انھیں اس موضوع پر جدید ریسرچ متھڈولوجی کو اپنانے سے روکتا ہے۔

امام علی بن ابی طالب کی خلافت کے خلاف جیسے اصحاب جمل نے ایک مذہبی بیانیہ تشکیل دیا تھا، ویسے ہی ایک مذہبی بیانیہ امیر شام نے بھی ترتیب دیا۔

اصحاب جمل کی قیادت کرنے والے غیر اموی صحابہ کرام اور ام المومنین عائشہ صدیقۃ رضی اللہ عنہا جو تھیں ان کے ہاں "قصاص عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ "کا جو مطالبہ تھا اس میں ہم حضرت علی ابن ابی طالب کو قصوروار ٹھہرایا جانے والا ایک جملہ بھی نہیں دیکھتے۔ ابتدائی طور پر مدینہ کے اموی مہاجر اشراف تھے جن میں نمایاں طور پر حضرت سعید بن العاص ، جضرت سعید بن زید جیسے صحابی ہیں ان کو بھی ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم پر قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام لگاتے نہیں دیکھتے۔ ایسے ہی مغیرہ بن شعبہ کو بھی ہم گورنر کوفہ بننے سے پہلے یہ الزام عائد کرتے نہیں دیکھتے۔ بلکہ ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کو جنگ جمل کے بعد اپنے خروج کو غلط ٹھہرایا اور وہ اکثر اس حوالے سے اشکبار ہوجایا کرتی تھیں۔
سعید بن زید تو ہمیں امیر شام کے سامنے علی ابن ابی طالب پر سب و شتم ہوتا دیکھ کر جذباتی ہوتے دکھائی دتیے ہیں ۔

لیکن امیر شام کے زمانے سے بنوامیہ کا جو مجموعی مذہبی بیانیہ ہے وہ حضرت علی ابن ابی طالب سمیت کئی ایک صحابہ کرام پر قتل عثمان ابن عفان کا الزام دھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس مذہبی بیانیہ کا ایک جزو حضرت علی ابن ابی طالب کی ولایت کا انکار بھی ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اکثر لوگوں کی یادداشت میں "واقعہ رحبہ یا واقعہ مناشدہ رحبہ" نہیں ہے۔

یہ واقعہ کب پیش آیا۔ اس حوالے سے امامی شیعہ عالم علامہ ابراہیم امینی نے اپنی مشہور کتاب "الغدیر" کی جلد اول میں اس واقعہ کے پیش آنے کی تاریخ 35 ھجری

درج کی ہے۔ لیکن 35 ھجری میں امام علی ابن ابی طالب کا کوفہ میں آنا ہی ثابت نہیں ہے۔ ہمیں "وقعۃ الصفین" نصر ابن مزاحم بتاتے ہیں کہ علی ابن ابی طالب رجب کی 11 تاریخ اور سن 36 ھجری میں کوفہ میں آمد بتاتے ہیں۔ اورنصر ابن مزاحم ہمیں بتاتے ہیں اور کوفہ میں اپنی آمد کے بعد اہل کوفہ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ کہاں پر ٹھہریں گے ؟ کیا محل میں؟ تو آپ وہاں ٹھہرنے سے انکار کرتے ہیں اور نصر ابن مزاحم کی روایت کے مطابق وہ "الرحبۃ" پر قیام کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ "مسجد اعظم" کوفہ میں داخل ہوکر دو رکعات نماز ادا کرتے ہیں۔

اس سے ہمیں یہ تو پتا چل جاتا ہے کہ ایک تو آپ 11 رجب المرجب 36 ھجری کو کوفہ میں آئے اور دوسرا ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ رحبہ نامی جگہ اس وقت مسجد کوفہ کا حصّہ نہیں تھی ۔ نہج البلاغہ کی شرح لکھنے والے معروف عالم ابن ابی الحدید "الرحبۃ الکوفۃ" درج کرتے ہیں جب اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں ۔ رحبہ عربی زبان میں نشیب کے وسیع میدان کو کہتے ہیں اور کوفہ میں یہ نشیب میں وسیع میدان کوفہ کی جامع مسجد کے سامنے واقع تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعہ امام علی ابن ابی طالب کی 36 ھجری میں کوفہ آمد کے فوری بعد پیش آیا۔ کوفہ میں ہمیں ایسے افراد کے موجود ہونے کا پتا چلتا ہے جنھیں بعد ازاں مورخین شیعان عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ میں شمار کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اگرچہ جنگ جمل میں اصحاب جمل کے ساتھ شرکت نہیں کی تھی لیکن جس وقت امام علی ابن ابی طالب نے عمار بن یاسر، امام حسن، مالک الاشتر اور حجر بن عدی کو اہل کوفہ کی طرف بھیجا تھا مسجد کوفہ میں کئی ایک اشخاص نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا۔ نصر ابن مزاحم نے ایک ایسے شخص کا بطور خاص

ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کان عثمانیا اور پھر بتایا کہ وہ امیر شام سے رابطے میں تھا جب امیر شام غالب آئے تو اسے الجزیرہ میں قطعات اراضی بھی دیے گئے تھے۔

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ افراد کی طرف سے غدیر خم کے واقعے کو جھٹلایا گیا اور حضرت علی ابن ابی طالب کے ایمان والوں کا مولا ہونے کا انکار کیا گیا۔ یہ پروپیگنڈا جب زیادہ شدید ہوا تو آپ نے کوفہ کے جامع مسجد کے سامنے جو میدان تھا وہاں لوگوں کا ایک اجتماع کیا اور اس میں آپ نے کوفہ میں موجود ان صحابہ کرام کو خصوصی طور پر دعوت دی جو باحیات تھے اور غدیر خم میں ہونے والے واقعے کے عینی شاہد تھے۔ رحبہ میں ہونے والے اجتماع کے ایک شاہداور راوی صحابی رسول حضرت عمیرہ بن سعد ہیں جو کوفہ میں رہائش پذیر تھے۔ امام نسائی نے خصائص النسائی میں ان کی روایت درج کی ہے

عمیرة بن سعد قال انہ سمع علیا وھو ینشد فی الرحبۃ: من سمع رسول اللہ یقول من کنت مولاہ فعلی مولاہ؟ فقام بضعۃ عشر فشھدوا

یہ حدیث سنن الکبری میں نسائی نے جلد 7 ص 438، المعجم الکبیر جلد 5 ص 192 پر درج کیا ہے۔ اس واقعے کے عینی شاہد عبدالرحمن بن ابی لیلی بھی ہیں انھوں نے بھی رحبۃ کے مقام پر حضرت علی ابن ابی طالب کو لوگوں اللہ کی قسم دے کر پوچھا تھا کہ وہ بتائیں کہ کیا انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ جس کا میں مولا ہوں تو اس کے علی ابن ابی طالب بھی مولا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پہ بارہ

اصحاب رسول نے کھڑے ہوکر اس بات کی تصدیق کی کہ رسول اللہ نے ایسے ہی فرمایا تھا۔ کوفہ میں ہی رہنے والے ایک اور صحابی رسول حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ بھیاس واقعے کے شاہد ہیں اور ان کی یہ گواہی ہمیں مسند امام احمد جلد ایک ص 119 حدیث نمبر 19514 پر ملتی ہے۔ صحابی رسول حضرت سعید بن وھب اور تابعی حضرت زید بن یثیع بھی اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ حضرت زید بن یثیع کا کہنا ہے کہ انہوں نے منبر کوفہ پر علی ابن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم لوگوں میں سے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا "من کنت مولاہ فھذہ علیا مولاہ" انہیں اللہ کی قسم ہے وہ گواہی دیں۔۔۔الخ

اس واقعے کے حوالے سے وارد ان احادیث کو حافظ ابن کثیر، حافظ ذھبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی بھی ٹھیک مانتے ہیں اور اس کی اسناد کو جید کہتے ہیں۔

حضرت زید بن یثیع نے اپنی روایت میں یہ بھی کہا کہ اس موقعہ پر اس مجمع میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو اس حدیث سے واقف تھا اور غدیر خم کے واقعے کے وقت موجود بھی تھا۔ اس نے نہ تو ہاتھ کھڑا کیا اور نہ ہی کوئی بات کی ۔ امام علی ابن ابی طالب نے اس سے کہا کہ کیا وہ اس سے واقف نہیں؟ تو اس نے کہا کہ وہ بھول گیا تھا اسے یاد نہیں رہا۔۔الخ

جن صحابہ کرام نے یہ گواہی دی تھی ان میں ہمیں ابوعمرہ انصاری، ابوالھیثم بن التیھان، ابوایوب انصاری، خزیمۃ بن ثابت انصاری (ذو الشھادتین)، سھل بن حنیف، ابوسعید خدری، سھل بن سعد انصاری، عبداللہ بن ثابت انصاری (خادم رسول

خدا)، عبید بن عازب انصاری، عدی بن حاتم، ناجیة بن عمرو خزاعی، نعمان بن عجلان انصاری، زید بن ارقم، عمار بن یاسر کے نام ملتے ہیں۔ ان ناموں سے بھی ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک تو یہ واقعہ جنگ صفین سے پہلے پیش آیا اور دوسرا ھجری سال 36 میں پیش آیا –

نصر ابن مزاحم نے "وقعۃ الصفین" میں ذکر کیا ہے کہ امیر شام نے ابو مسلم خولانی کے ہاتھ ایک خط امام علی ابن ابی طالب کے لیے بھیجا تھا۔ اس خط کا متن اکثر تواریخ کتب میں موجود ہے۔ اور اس کا جواب امام علی ابن ابی طالب نے جو دیا وہ بھی موجود ہے۔ اس خط کے مندرجات سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ خط اس وقت علی ابن ابی طالب کو ملا جب وہ شام کے خلاف جہاد کے لیے لشکر ترتیب دے رہے تھے۔ علی ابن ابی طالب نے کوفہ آمد کے اگلے دن ہی اپنا سفیر شام روانہ کردیا تھا جو 37 ھجری میں واپس ہوئے تھے۔

امیر شام کا مکتوب 36 ھجری کے وسط میں یعنی جمادی الثانی میں امام علی ابن ابی طالب کو ملا۔ اس خط میں امیر شام صحابہ کرام میں کون سب سے افضل ہے کا مسئلہ چھیڑتے ہیں ۔ اور مجھے تاریخ کی اولین عرب روایت میں کہیں کسی اور کے ہاں امیر شام سے پہلے مسئلہ تفضیل اٹھاتے ہوئے کوئی صحابی رسول ﷺ نظر نہیں آتا۔ ہاں السابقین الاولین مہاجر و انصار صحابہ کے ہاں ہمیں یہ روش ضرور ملتی ہے کہ وہ اہل بیت کے فضائل صحابہ کرام سے الگ کرکے بیان کیا کرتے تھے۔ ہمیں اصحاب جمل میں موجود کوئی مہاجر یا انصاری صحابی بھی اس مسئلے کو اٹھاتا نظر نہیں آتا

اور نہ ہی ان میں سے کوئی علی ابن ابی طالب کے اسلام میں سبقت و قرابت کو چیلنج کرتا نظر آتا ہے۔

تابعین میں اسلام کی اولین عرب روایت تاریخ میں ہمیں مسئلہ تفضیل کو عامر بن شراحیل الشعبی کے ہاں کثرت سے بیان ہوتا دیکھتے ہیں۔ اور اس معاملے پر عبدالملک بن مروان کے زمانے میں ایک باقاعدہ مذہبی بیانیہ کی تشکیل ہوتے بھی پاتے ہیں۔

اس تجزیہ سے ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بنوامیہ والے تھے جو قتل عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے معاملے کو لیکر خود حضرت علی ابن ابی طالب کے اسلام میں مقام و مرتبے کو بھی چیلنج کررہے تھے اور ان کا مذبی بیانیہ امام علی ابن ابی طالب کے مقام و مرتبے کے بیان میں تخفیفی ، سلبی اور انکار جیسی حالتوں میں تھا۔

ایسا مذہبی بیانیہ جو امام علی ابن ابی طالب کی ولایت کے انکار پہ استوار ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا بیانیہ تھا جس کی تردید لازم تھی ۔ اس مذہبی بیانیہ کا ایک جزو اور تھا ۔ اور وہ یہ تھا کہ شروع سے یہ دکھایا جائے کہ علی ابن ابی طالب جو تھے وہ اقتدار اور امارت کے سوال پر شروع دن سے لڑائی کی حالت میں تھے اور وہ پہلے دن سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ اس کے لیے بہت ضروری تھا کہ اسلام کی نظر میں جو علی ابن ابی طالب کا مقام اور مرتبہ تھا اسے ہی مشکوک ٹھہرایا جائے۔ یہ پروپیگنڈا اتنا شدید تھا کہ حضرت علی ابن ابی طالب کو کوفہ

کے میدان میں ایک اجتماع کرنا پڑا اور اپنے مقام و مرتبہ کے گواہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی قسم دلواکر ان سے گواہی لینا پڑی ۔

اس لیے اس واقعہ کو "یوم رحبہ ومناشدہ" کہا جاتا ہے۔

کیونکہ اگر ولایت علی المرتضی کا عقیدہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں غالب رہتا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ سے لڑنے والے اور آپ پر قتل عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا الزام دھرنے والے اپنے مذہبی بیانیہ کے لیے حمایت عام مسلمانوں میں کیسے پیدا کرتے۔

یہاں پر میں جب اپنے اہل السنۃ و الجماعۃ کے جمہور آئمہ و فقہا و محدثین کے ہاں خلافت راشدہ کی تقدیس کا مذہبی بیانیہ دیکھتا ہوں جن کے نزدیک خلفائے راشدین پانچ ہیں (اگرچہ عوام الناس میں زیادہ تر چار مقبول ہیں کیونکہ ہمارے جلسوں اور محافل میں "حق چار یار" کا نعرہ لگتا ہے) تو میرے ذہن میں بیک وقت یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جمہور اہل سنت و جماعت کا یہ مذہبی بیانیہ ہمیں بنوامیہ کے مذہبی بیانیہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں امام حسن علیہ السلام کی خلافت سے دست برداری کے بعد بنوامیہ کے کسی ایک بادشاہ یا کسی ایک گورنر کا کوئی ایک قول ہی تلاش کرسکوں جس میں انھوں نے امام علی ابن ابی طالب اور امام حسن کو خلفائے راشدین

میں شمار کیا ہو۔ میری یہ بات جو لوگ پڑھ رہے ہوں اگر ان میں سے کسی کو علم ہو تو مجھے ضرور مطلع کرے میں اپنی رائے سے رجوع کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔

اگر ہم انعقاد خلافت علی ابن ابی طالب سے متعلق سارا تاریخی مواد اکٹھا کرلیں تو ہمیں انعقاد خلافت کے بارے میں دو بڑے مذہبی بیانیے ملیں گے۔

ایک مذہبی بیانیہ وہ ہے جو اصحاب جنگ جمل اور اصحاب شام نے اختیار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ امام علی ابن ابی طالب کی خلافت پر مدینہ میں زبردستی اور تلوار کے زور پر بیعت اس گروہ نے دلوائی جس نے پیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ابن عفان کو شہید کیا تھا۔ حضرت زبیر بن العوام اور حضرت طلحہ سے یہ بیان منسوب کیا گیا کہ ان سے زبردستی بیعت قاتلان عثمان ابن عفان نے کرائی ۔ اس مذہبی بیانیہ کے مطابق حضرت علی ابن ابی طالب کو خلیفہ بنائے جانے میں مدینہ کے انصار اور مہاجر صحابہ کرام کی اکثریت کا اتفاق شامل نہیں تھا۔ اس مذہبی بیانیہ کے پہلے حامل اصحاب جمل تھے اور بعد ازاں اس مذہبی بیانیہ کے علمبردار دمشق والے رہے۔

دوسرا مذہبی بیانیہ امام علی ابن ابی طالب کا تھا جسے شیعان علی ابن ابی طالب نے اپنایا ۔ جس وقت امام علی ابن ابی طالب کی بیعت مدینہ میں ہوگئی تو آپ نے اپنا ایک خط معاویہ ابن ابی سفیان گورنر شام کے نام لکھا اور اپنے قاصد کو شام روانہ کیا۔ 25 ذی الحج 35 ھجری جمعہ کے روز مدینہ میں امام علی ابن ابی طالب کی بیعت ہوئی تھی۔ آپ نے اس کے فوری بعد حضرت سبرہ الجہنی رضی اللہ عنہ کو بطور قاصد شام کی طرف روانہ کیا اور اپنا خط معاویہ ابن ابی سفیان کے نام بھیجا۔ اس

خط میں آپ نے معاویہ ابن ابی سفیان کو بتایا کہ السابقون و الاولون من المہاجرین و الانصار کی اکثریت نے ان کو خلیفہ بنانے پر اتفاق کیا ہے اور یہی ارباب حل وعقد ہیں ، یہی جماعت ہیں ان کے اتفاق کے بعد دوسروں کو بھی اتفاق کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ السابقون و الاولون من المہاجرین والانصار کی اکثریت ہی جماعت ہے اور اس پر ہی اللہ کا ہاتھ ہوا کرتا ہے------۔ امام علی ابن ابی طالب کے قاصد حضرت سبرہ الجہنی شام پہنچے تو انہوں نے جب بھی معاویہ ابن ابی سفیان سے جواب مانگا تو انہوں نے جواب اشعار میں دیا

ادم دامۃ حصن او جدا بیدی

حربا ضر و سا اتشب الجزل والضرما

ایسے جمے رہو جیسے قلعہ یا پھر مجھے خطرناک جنگ کی دعوت دو جو جوان اور بچوں کو بوڑھا کردے

فی جارکم و ابنکم اذ کان مقتلہ

شنعاء شیب الاصداغ و اللمما

تمہارے پڑوسیوں اور لڑکوں کا ایسے قتل ہوگا کہ کنپٹی اور سر کے بال سفید ہوجائیں گے

اعیا المسدود بھا و السیدون فلم

یوجد طعا غیرنا مولی و لا حکما

سردار اور خادم دونوں عاجز ہوجائیں گے

اور ہمارے علاوہ نہ تو کسی کو والی پائیں گے نہ ہی حکمران

صفر کے مہینے میں سن 36 هجری میں معاویہ ابن ابی سفیان کی جانب سے بنوعبس کا ایک شخص خالی کاغذوں کا پلندہ لیکر مدینہ امام علی ابن ابی طالب کے پاس پہنچتا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب اس کے بعد ہی جنگ کی تیاری کرنے لگ جاتے ہیں اور ان کا ارادہ شام جاکر لڑائی لڑنے کا ہوتا ہے۔ درمیان میں جنگ جمل آجاتی ہے اور آپ اس سے فارغ ہوکر جیسے ہی کوفہ پہنچتے ہیں تو جریر بن عبداللہ کو اپنے خط کے ساتھ دمشق روانہ کرتے ہیں۔

اس خط کا متن نصر ابن مزاحم نے اپنی کتاب "وقعۃ الصفین" میں درج کیا ہے - اور اس خط کا کچھ متن نہج البلاغہ میں مکتوبات میں چھے نمبر پر ہے۔ (نہج البلاغہ ص267 مکتوب نمبر 6 مطبوعہ دارالعلم بیروت) ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کی جلد سات کے صفحہ 231 پر نہج البلاغہ میں امام علی کے مذکورہ خط کے کچھ حصے کا متن زکر کرنے کے بعد اس خط کا پورا متن دیا ہے۔ وہ اس خط کی شرح کے آغاز میں ہی لکھتے ہیں کہ "و قد زکرہ ارباب السیرۃ کلھم/ اور بے شک تمام سیرت(علی ابن ابی طالب لکھنے والوں نے اس (خط) کا زکر کیا ہے۔ و اوردھم شیوخنا فی کتبھم احتجاجا علی صحۃ الاختیار، و کونہ طریقا الاماماۃ – اور ہمارے شیوخ (اساتذہ نے بھی اس کو اپنی کتابوں میں ٹھیک حکومت کے لیے بطور حجت اور دلیل کے درج کیا ہے اور اور امامت کا طریقہ بھی یہی ہے) -

حضرت علی ابن ابی طالب کا یہ انتہائی اہم خط ہے جو انعقاد خلافت پر ان کے مذہبی بیانیہ پر پوری روشنی ڈالتا ہے

بے شک میری بیعت مدینہ میں کی گئی تو تمہارے اوپر بھی یہ لازم ہے اور اہل شام پر بھی اس کا کرنا لازم ہے۔ بے شک میری اس قوم نے کی ہے جس نے ابوبکر و عمر و عثمان(رضی اللہ عنہم) کی بیعت کی تھی اور وہ اب میری بیعت میں ہیں۔ اس کے بعد جو شاہد ہے اس کے لیے (سوائے بیعت کے) اور کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور جو موجود نہیں تھا اس کے لیے اسے رد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ شوری / حق مشاورت مہاجرین اور انصار کے پاس ہے اور جب وہ کسی آدمی پر جمع ہوکر اسے امام بنالیں تو وہی اللہ کی رضا ہے۔ جو کوئی طعن یا رغبت سے ان کے اتفاق سے باہر نکلے گا تو جہاں سے وہ نکلے گا اسے وہیں لوٹا دیا جائے گا۔ اگر وہ انکاری ہوگا تو اس کے ایمان والوں کے راستے کی اتباع سے انکار کرنے کے سبب قتال کیا جائے گا۔--------------- جہاں تک (حضرات) طلحہ و زبیر کی بات ہے تو دونوں نے میری بعیت کی اور پھر دونوں نے ہی توڑ دی----- ہم نے ان دونوں سے جہاد کیا یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا امر غالب ہوا چاہے دوسروں کو یہ ناپسندیدہ کی کیوں نہ تھا۔ تو تم بھی وہاں داخل ہوجاؤ جہاں مسلمان داخل ہوئے ہیں۔اگر تمہیں یہ امور پسند آتے ہیں تو اس میں تمہارے لیے عافیت ہے---------

اس خط میں امام علی ابن ابی طالب لکھتے ہیں

ولعمری لئن نظرت دون ھواک لتجدنی ابرا قریش من دم عثمان – واعلم انک طلقاء لاتحل لھم الخلافۃ ولا تعرض فیھم الشوری

اگر تم خواہش نفسانی سے ہٹ کر غور کروگے تو مجھے قریش میں سے خون عثمان سے مبرا پاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ تم طلاقاء ہو اور تمہارے لیےخلافت جائز نہیں ہے اور شوری پر اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔

نصر ابن مزاحم نے اس خط کا مکمل متن درج کرنے کے فوری بعد بتایا ہے کہ جب جلیل القدر صحابی رسول جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اس خط کے ساتھ دمشق پہنچے اور دربار میں انھوں نے اس خط کا متن پڑھنے سے پہلے ایک خطبہ دیا ، اس خطبے کا متن بھی نصر بن مزاحم نے درج کیا ہے، اس میں جریر بن عبداللہ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں

الا و ان ہذا الدین لا یتحمل الفتنۃ ، الا و ان العرب لا یحتمل السیف ------ جان لو بے شک یہ دین فتنے کا متحمل نہیں ہوسکتا اور یہ بھی جان لو کہ عرب جنگ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ -----

اس کے بعد جریر بن عبداللہ نے امیر شام کو امام علی ابن ابی طالب کی بیعت کرنے کو کہا اور ان سے بھی کہا کہ شام کی گورنری کوئی لازمی نہیں ہے کہ آپ کے پاس ہی رہے –

اب امام علی ابن ابی طالب کے دیگر خطوط جو ہیں ان میں بھی انعقاد خلافت کے اسی طریقہ کار کو بیان کیا گیا ہے جو اس پہلے خط میں بیان کیا گیا تھا۔

نصر ابن مزاحم نے لکھا ہے کہ جریر بن عبداللہ کی تقریر اور امام علی کا خط پڑھنے کے بعد امیر شام نے جریر بن عبداللہ سے کہا کہ تم بھی انتظار کرو، میں بھی کرتا ہوں تاآنکہ ہم اہل شام کی رائے سے واقف ہوجائیں۔ اس کے بعد امیر شام نے لوگوں کو دمشق کی جامع مسجد میں اکٹھا ہونے کی منادی کرائی ۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو انھوں نے ان کے سامنے ایک لمبی تمہید باندھنے کے بعد کہا " اے لوگو! مجھے عمر بن خطاب اور عثمان ابن عفان نے تم پر گورنر مقرر کیا تھا-------- پھرعثمان (ابن عفان رض) مظلومی کی حالت میں قتل کردیے گئے------ اور پھر یہ آیت قران پڑھی

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا

اور جو کوئی ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے واسطے اختیار دے دیا ہے لہٰذا قصاص میں زیادتی نہ کرے، بے شک اس کی مدد کی گئی ہے۔(سورہ اسرا ، ایت 33)

اس کے بعد کہا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ قتل عثمان (رض) کے بارے میں تم مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے

یہ سنکر اہل شام کا وہ مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور انھوں نے "خون عثمان" کے بدلہ لینے کی بات کا جواب ہاں میں دیا۔ اور اس مطالبے پر ہی امیر شام کی بیعت کرلی ۔ انہوں نے امیر شام کی بات کی توثیق کی کہ وہ یا تو وہ اپنی جانوں اور اموال کو اس کام کے لیے وقف کردیں اور بدلہ لیں یا پھر اللہ ان کی ارواح کو فنا کردے۔

نصر بن مزاحم نے ہمیں بتایا کہ اس کے بعد امیر شام نے یزید بن اسد۔ بسر بن ارطاۃ، عمرو بن سفیان، مخارق الحارث الزبیدی ، حمزہ بن مالک ، حابش بن سعد الطائی کو بلایا – یہ سب بنوقطحان یمن کے روساء تھے ۔ ان کو کہا کہ وہ شام کے سب سے بڑے زاہد مبلغ شرحبیل بن السمط سے ملیں اور اس کو ان کا خط دیں ۔ یہ خط ابن السمط کو حمص میں ملا۔ ابن السمط نے شام میں آباد اہل یمن سے مشورہ کیا تو ان میں اس پہ اختلاف ہوگیا۔ عبدالرحمان بن غنم اذدی کی رائے تھی کہ جریر کے خط پہ عمل کیا جائے اور علی ابن ابی طالب کی بیعت کرلی جآئے کیونکہ ان پر مہاجرین و انصار نے اتفاق کیا ہے۔ شراحبیل اس کے بعد دمشق پہنچا تو یہاں لوگوں نے اس سے بہت عزت و احترام کا سلوک کیا۔ اس کی امیر شام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے
شرحبیل کو جریر بن عبداللہ کے ہاتھوں امام علی ابن ابی طالب کے خط بارے بتایا اور کہا میں تو اہل شام کی رائے کے ساتھ کھڑا ہوں تم بھی ان سے رائے لے لو۔ شرحبیل لوگوں میں کہا تو بہت بڑے مجمعے نے امام علی ابن ابی طالب پر قتل عثمان کا الزام لگایا اور اس کے بعد شرجبیل نے امیر شام سے مل کر کہا کہ انھیں اہل عراق سے جنگ کرنی چاہئیے۔ شرجبیل اس کے بعد شام کے شہروں میں گیا اور جہاں گیا اس نے امام علی ابن ابی طالب کو خون عثمان بن عفان کا ذمہ دار ٹھہرایا اور وہ حمص آیا اور یہاں بھی اس نے یہی الزام عائد کیا۔

اس دوران امیر شام نے عمرو بن عاص سے خط و کتابت کی اور مصر ان کو دینے کا وعدہ کرلیا۔ جبکہ دوسری طرف ان کو ولید بن عقبۃ نے اشعار کی صورت مکتوب لکھ کر بھیجا اور ان سے امام علی ابن ابی طالب کے خلاف صف آرا ہونے کو کہا۔

نصر بن مزاحم لکھتا ہے کہ 12 ماہ جریر بن عبداللہ دمشق میں رہے اور اس دوران امیر شام نے شام کے شہروں میں امام علی ابن ابی طالب اور اور ان کے پیروکاروں عراقیوں کو قتل عثمان ابن ابی عفان کے ذمہ دار کے طور پر پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ شام میں یمنی قبائل کے اندر اس بیانیہ کی ژحالفت کے آثار تھے لیکندھیرے دھیرے وہ ژحالفت مقبول عام بیانیہ کے شور میں دبتا چلا گیا۔ اور آخرکار امیر شام نے جریر بن عبداللہ کو واپس لوٹنے اور جاکر امام علی کو یہ بتانے کو کہا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔ جبکہ خود علی ابن ابی طالب نے بھی جریر بن عبداللہ کو لوٹ آنے کا کہا۔

اس تفصیل سے بھی ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ امام علی ابن ابی طالب نے اپنی انعقاد خلافت کے لیے جس مذہبی بیانیہ کو اپنے خط میں واضح کیا تھا، اس کے مدمقابل کون سا بیانیہ بنایا گیا۔

"علی ابن ابی طالب اور اہل عراق قاتلان عثمان بن عفان ہیں اور ان سے قصاص لینے کے لیے جنگ لڑنا پڑے گی۔"

اس بیانیہ کے ساتتھ ساتھ عمرو بن عاص کے مشورے سے امیر شام نے علی ابن ابی طالب کو جریر بن عبداللہ کے زریعے ایک خط میں یہ تجویز بھی دی کہ وہ شام اور مصر ان کو دے دیں اور حجاز و عراق پر خود براجمان رہیں - یہ مغیرہ بن شعبہ کی تجویز میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پیش کی جانےوالی تجویز تھی جسے ظاہر سی بات ہے علی ابن ابی طالب نے رد کردیا۔

اب ہم یہاں رک کر زرا امام علی ابن ابی طالب کا موقف اور اس موقف کی طرف حجاز اور عراق میں رسپانس دیکھنے کی کوشش ایک بار پھر کرتے ہیں - حجاز میں مدینہ کے اندر ایک گروہ غیر جانبداروں کا تھا۔ ایک گروہ آپ کے ساتھ مکمل اخلاص کے ساتھ بیعت کرچکا تھا اور ان میں سے بہت سارے آپ کے ساتھ کوفہ چلے آئے تھے۔ تیسرا گروہ اموی اشراف کا تھا جن میں کئی ایک نے بظاہر بیعت کی تھی لیکن وہ آپ پر معاویہ ابن ابی سفیان کو شام سونپ دینے پر اصرار کررہے تھے - اور مدینہ میں قریش کے کافی بڑی تعداد میں لوگ آپ کی طرف سے اہل شام سے جنگ کرنے کے فیصلے پر آپ سے الگ ہوگئے تھے۔ مکّہ میں آپ کی حمایت کافی طاقتور نہ تھی اور یہاں پرانی مکّی قریشی اشرافیہ کا غلبہ تھا۔ بصرہ میں شیعان عثمان کی ایک بڑی تعاد موجود تھی اگرچہ حجاز اور بصرہ سے اصحاب جمل کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے والوں کی شکست کے بعد وقتی طور پر ان کی پوزیشن کمزور ہو گئی تھی۔ بصرہ میں زیاد بن ابیہ، اشعث بن قیس جیسے کئی روسائے عرب کی حمایت آپ کی طاقت اور قوت کے غلبے کے سبب تھی - یہاں بھی شیعان علی ابن ابی طالب تعداد میں کافی کم تھے۔

لے دے کر کوفہ ایک ایسا شہر تھا جہاں اشراف القبائل کی سردار اشرافیہ کو چھوڑ کر اہل السواد الارض ، دیگر غیر اشراف درجنوں قبائل کے محلوں ، انصار محلے میں آپ کی بہت بڑی تعداد میں حمایت تھی اور یہ وہ تھے جنھیں بعد میں امیر شام اور دیگر اموی حکمرانوں نے شیعہ بوتراب کہہ کر پکارا۔

امام علی ابن ابی طالب کے احساسات کیا تھے ؟ آپ کو شدت سے یہ احساس تھا کہ حجاز اور عراق میں کئی ایک ایسی عظیم شخصیات تھیں جو نیک تھیں، پاکباز تھیں ، عبادت گزار تھیں ، ان کا بہت عزت و احترام تھا اور ان میں ے کئی ایک اس بات کا برملا اقرار بھی کرتی تھیں کہ حضرت علی ابن ابی طالب کے مقابلے میں پورے بلاد اسلامہ میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو اس زمانے میں علی ابن ابی طالب کے مقابلے میں حقدار امامت و خلافت ہوتا۔ ان کے اس موقف کا تقاضا تو یہ بنتا تھا کہ وہ علی ابن ابی طالب کے ساتھ مل کر ان کے موقف کا دفاع کرتے لیکن انہوں نے "غیر جانبداری" اختیار کرلی ۔

جبکہ ان میں سے چند ایک جو تھے انھوں نے اہل شام اور ان کے حجاز و عراق میں حامیوں کی جانب سے علی ابن ابی طالب کی کردار کشی کی مہم کا رد کرنے کی بجائے اس پر یا تو خاموشی اختیار کرلی یا انہوں نے برملا امیر شام سے ہاتھ ملالیا تھا۔ غیر جانبدار مگر دفاع مقام علی ابن ابی طالب کرنے والے اور بالکل خاموش یا شام والوں سے ہاتھ ملانے والوں میں کئی ایک یا تو خود اولین انصار و مہاجر صحابہ کی باقیات تھی یا ان کی اولاد تھی ۔ علی ابن ابی طالب کے ساتھ دینے والوں میں حجاز، عراق میں ایسے نوجوان ضرور موجود تھے جو مذکورہ بالا دو گروہوں کی اہل شام کے علی ابن ابی طالب کے بارے مں سلبی، منفی اور تخفیفی پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے تھے اور اس

نے امام علی ابن ابی طالب کو نہ صرف دفاعی پوزیشن میں لاکر کھڑا کیا بلکہ ان کے "احساس تنہائی" کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔

امام علی ابن ابی طالب کے بارے میں میں نے یہ جو لکھا ہے کہ ان کے احساس تنہائی و بے گانگی کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ احساس تنہائی و بے گانگی مدینہ میں بعد از وفات النبی ﷺ ہی شروع ہوگیا تھا۔ میں نے اس حوالے سے تاریخ اور احادیث کے ابتدائی لٹریچر کو دیکھنا شروع کیا تو بنوامیہ کی بھرپور کوششوں کے باوجود ہمیں اس لٹریچر میں کہیں نہ کہیں اس تنہائی اور بے گانگی کا سراغ مل جاتا ہے۔

اس معاملے میں ہماری بہت بڑی مدد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مرتب کردہ موجموعہ احادیث کرتی ہے جسے ہمارے اہل سنت و جماعۃ کے مجموعہ حدیث میں "کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح احادیث کی پہلی کتا ب کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں ہمیں مُحَمَّد بن شہاب زھری کی سند سے عروہ بن زبیر کے واسطے سے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ملتی ہے۔

وكان لعلي من الناس وجه حياة فاطمة، فلما توفيت استنكر علي وجوه الناس فالتمس مصالحة ابي بكر ومبايعته، ولم يكن يبايع تلك الاشهر، فارسل إلى ابي بكر ان ائتنا ولا ياتنا احد معك كراهية لمحضر عمر، فقال عمر: لا والله لا تدخل عليهم وحدك، فقال ابو بكر: وما عسيتهم ان يفعلوا بي، والله لآتينهم، فدخل عليهم ابو بكر فتشهد علي فقال: إنا قد عرفنا فضلك وما اعطاك الله ولم ننفس عليك خيرا ساقه الله إليك، ولكنك استبددت

علينا بالامر، وكنا نرى لقرابتنا من رسول الله ﷺ نصيبا حتى فاضت عينا ابي بكر، فلما تكلم ابو بكر قال: والذي نفسي بيده لقرابة رسول الله ﷺ احب إلي ان اصل من قرابتي، واما الذي شجر بيني وبينكم من هذه الاموال فلم آل فيها عن الخير، ولم اترك امرا رايت رسول الله ﷺ يصنعه فيها إلا صنعته، فقال علي لابي بكر: موعدك العشية للبيعة، فلما صلى ابو بكر الظهر رقي على المنبر فتشهد وذكر شان علي، وتخلفه عن البيعة وعذره بالذي اعتذر إليه، ثم استغفر وتشهد علي، فعظم حق ابي بكر وحدث انه لم يحمله على الذي صنع نفاسة علىابي بكر ولا إنكارا للذي فضله الله به ولكنا نرى لنا في هذا الامر نصيبا، فاستبد علينا، فوجدنا في انفسنا، فسر بذلك المسلمون وقالوا: اصبت، وكان المسلمون إلى علي قريبا حين راجع الامر المعروف

(صحیح بخاری ، حدیث نمبر 4240

"فاطمہ سلام اللہ علیھا جب تک زندہ رہیں علی علیہ السلام پر لوگ بہت توجہ رکھتے رہے لیکن ان کی وفات کے بعد انہوں نے دیکھا کہ اب لوگوں کے منہ ان کی طرف سے پھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینا اور ان سے بیعت کر لینا چاہا۔"

وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد کے چھے ماہ امام علی ابن ابی طالب کی طرف سے گوشہ نشینی میں گزارے گئے۔ سب مورخین اس بات سے متفق ہیں کہ ثقیفہ بنو ساعدہ میں مہاجر و انصار صحابہ کرام کے اجتماع میں بنوہاشم سے مہاجرین السابقون الاولون میں

سے کوئی بھی شامل نہیں تھا۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ فاطمہ بن محمؐد سلام اللہ علیہا کی وفات ، رسول اللہ کی وفات کے چھے ماہ بعد ہوئی ۔ بخاری و مسلم کی روایات سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ فاطمہ بنت محمؐد سلام اللہ علیہا اپنی وراثت کے معاملے کو لیکر وفات رسول اللہ کے پہلے مہینے کی آخری تاریخوں میں گئی تھیں۔ اور ان چھے میں علی ابن ابی طالب بھی گوشہ نشین رہے۔ آپ کا مکالمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے زکر کیا اس میں امام علی ابن ابی طالب قرابت رسول اللہ کے حوالے سے خلافت پر اپنا حق مقدم گرداتے ہیں۔ آپ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے

ولكنك استبددت علينا بالامر، وكنا نرى لقرابتنا من رسول الله ﷺ نصيبا

اور یہ سب سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت کیا ہوتی ہے

حتى فاضت عينا ابي بكر

اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں تو آپ خود امام علی علیہ السلام کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کس قدر اندر سے غم و اندوہ کا شکار ہوں گے۔

علی ابن ابی طالب کی تنہائی اور بے گانگی وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد سے شروع ہوگئی تھی ۔ یہ ایک ایسا مزضوع ہے جس سے فرقہ وارانہ مباحث تو ہماری چودہ سو سالہ مناظرانہ سنّی- شیعہ ادب میں بھرے پڑے ہیں۔ اور اہل السنہ و الجماعۃ مذہب اور شیعہ امامی مذہب کے درمیان اس معاملے پر علمی جدال تو صدیوں سے ہوہی رہا ہے لیکن کسی بھی تاریخ کے طالب علم نے اس پہ علی ابن ابی طالب کی وجودی حالت کو احساس انسانی اور جذبہ انسانی کے نکتہ نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی اگر کی تو آخرکار گروہی اور مناظرانہ دباؤ میں وہ اسے چند جملوں سے آگے نہ بڑھا سکا۔ سّی اسلام کا جو پاپولر اور مشہور عند الناس بیانیہ ہے اسے نجانے کیوں یہ لگتا ہے کہ اگر وہ اس بات کو مان لے گا کہ امر خلافت اور وراثت کے معاملات میں مدینہ کے مہاجرین بزرگ اہل حل والعقد کی اکثریت سے امام علی ابن ابی طالب، فاطمہ بنت مُحَمَّد سلام اللہ علیہا کے ساتھ کا اختلاف تھا اور اس معاملے میں علی ابن ابی طالب اور فاطمہ بنت مُحَمَّد سلام اللہ علیہا کی اقلیتی رائے کے سبب ان کے موقف کو تسلیم نہ کیے جانے سے ان میں دکھ، غم، تنہائی اور بے گانگی کے احساسات ابھرے تھے جس کا کئی جگہ انہوں نے اظہار بھی کیا تو اس سے شاید یہ معاملہ کفر اور ایمان کا بن جائے گا اور اس سے شیعہ امامیہ کے اندر موجود ایک اقلیتی سخت گیر اور انتہا پسند گروہ کی رائے کو تقویت ملے گی ۔ وہ اپنے اس خیال، اندیشے اور خوف کے سبب مستند احادیث اور اخبار تاریخ کو یا تو چھپالیتے ہیں یا اس کا زکر ہی نہیں کرتے۔ شہاب زھری کی روایت مذکورہ کے بارے میں بھی یہی رویہ ہے۔

یہ تنہائی اور بے گانگی اس وقت بہت زیادہ ہوگئی جب بلاد اسلامیہ میں طلقا جن میں پرانی مکّی قریشی اشرافیہ خود کو تحریک اسلامی کے رہبر، آئمہ کے طور پر خود کو پیش کرنا شروع کردیا۔ اور انھوں نے خود کو "شوری" کا حصّہ بنالیا۔ اور ساتھ ہی وہ پوری طاقت سے آپ اور آپ کے ساتھ دینے والوں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ سے مکالمے کے دوران بہت واضح طور پر کہا تھا

والذي نفسي بيده لقرابة رسول الله ﷺ احب إلي ان اصل من قرابتي

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کی قدرت میں میری جان ہس مجھے رسول اللہ کی قرابت سے اپنی اصل قرابت سے کہیں زیادہ محبت ہے۔

اور امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے قرابت اور خلافت کے رشتہ سے اپنی جس رائے کا اظہار کیا تھا ، اس پہ کہا

فلما صلى ابو بكر الظهر رقي على المنبر فتشهد وذكر شان علي

پس جب ابوبکر (صدیق رضی اللہ عنہ) نے نماز ظہر ادا کرلی تو وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور انھوں نے تشہد کے بعد شان علی (علیہ السلام) بیان کی

لیکن بنوامیہ کے امیر شام سے لیکر بعد میں نے آنے والوں نے خلاف علی ابن ابی طالب کے خلاف کیا رویہ اختیار کیا ؟

اگر جمہور مہاجر و انصار صحابہ کرام نے اجماعی طور پر ولایت علی میں لازمی خلافت دنیاوی کو شامل نہیں کیا تھا لیکن انھوں نے آپ کی تکوینی ولایت کا برابر اقرار کیا تھا اور اس کا اظہار بھی بار بار کیا۔ وہ منبروں پر شان علی المرتضی علیہ السلام بیان کرنے سے کبھی ہجکچاہے نہیں تھے۔ مگر قریشی مکّی اشرافیہ اور اہل شام نے تو ان کو براہ راست تیسرے خلیفہ راشد کے قل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے خلاف تلوار اٹھالی ۔ اور ان کی شان کی مکمل نفی کا موقف اختیار کیا۔

مجھے یہاں احمد شاملو کی نظم "راز" یاد آرہی ہے۔

با من رازی بود

که به کو گفتم

با من رازی بود

که به چا گفتم

تو را دراز

به اسب سیا گفتم

بیکس و تنها

به سنگای را گفتم

با راز کهنه

از را رسیدم

حرفی نروندم

حرفی نروندی

اشکی فشوندم

اشکی فشوندی

لبامو بستم

از چشام خوندی

دنیا پرستوں نے ان کی تنہائی اور بے گانگی کی شدت میں اضافہ کردیا تھا۔ اوریہاں تک ہوا کہ ان کے عدل و انصاف کی تاب ان کے بھائی عقیل ابن ابی طالب بھی نہ لاسکے اور عبداللہ بن عباس نے ان کا ساتھ تب چھوڑا جب عراق (بشمول کوفہ و بصرہ) میں واقعہ تحکیم کی آڑ لیکر ایک طرف تو بہت بڑا گروہ آپ سے الگ ہوگیا تھا اور آپ کے خون کا پیاسا ہورہا تھا اور آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے جنگ نہروان کے موقعہ پر لڑنا پڑی تھی۔ آپ کے انتہائی جانثار ساتھیوں میں عمار بن یاسر جنگ صفین میں شہید ہوگئے تھے اور پھر مالک الاشتر کے قل کا غم آپ کو کھائے جارہا تھا۔ جریر بن عبداللہ آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ موسی اشعری آخرکار اپنی "فتنے" کے متعلق تعبیر کے بوجھ تلے اگر آپ سے الگ ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ ادھر اشعث بن قیس اپنی تلوار کے نیچے آپ کے قتل کی سازش کررہا تھا۔ اشراف القبائل نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ شام نہیں جائیں گے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب علی ابن ابی طالب ، فاطمہ بنت محمؐد سلام اللہ علیھا کی تنہائی نے خاندان اہل بیت میں آگے سفر کرنا تھا اور یہ تنہائی آپ کی شہادت کے بعد امام حسن اور آپ کے جملہ خاندان میں منتقل ہوئی ۔ اور اس تنہائی کو ہم نے کوفہ میں شیعان علی ابن ابی طالب کے اندر سرایت ہوتے دیکھا۔ کیونکہ ایک وقت تھا کہ خلیفہ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر "شان علی " علیہ السلام

بیان کی تھی اور آج وہ وقت آگیا تھا کہ بنوامیہ کے بادشاہ اور گورنر منابر پر امام علی علیہ السلام اور آل بیت پر سب وشتم کررہے تھے۔ اور حجاج کے زمانے میں تو نوبت بہ این جا رسید کہ امام علی ابن ابی طالب کا نام لینا جرم ٹھہرگیا اور محدثین و مورخین "کان یقول صاحب الرحبۃ و المناشدہ" کہہ کر ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے شادمان ٹاؤن میں جامع مسجد رحمانیہ میں دو درجن لوگوں میں درس دے رہے تھے کہ انھوں نے بتایا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص سے جب کوئی شخص مناقب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرنے کو کہتے تو وہ لوگوں کو بہت رازدارانہ انداز میں بتایا کرتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ ایسی باتیں سرعام کرنے کا زمانہ نہیں رہا۔

شام میں آپ کی،شخصیت کے بارے میں سلبی پروپیگنڈا اسقدر شدید تھا کہ جب امام علی علیہ السلام کے بارے میں یہ خبر شام پہنچی کہ آپ روزے سے تھے اور مسجد میں نماز فجر پڑھارہے تھے جب آپ پر تلوار سے ضرب لگی اور آپ شہید ہوگئے تو اہل شام کی اکثریت اس بات پہ تعجب کررہی تھی کہ کیا علی ابن طالب روزے رکھتے اور نماز ادا کیا کرتے تھے۔

امام حسن شہید ہوئے اور یہ خبر دمشق کے دربار میں پہنچی تو دربار میں ایک شخص نے تبصرہ کیا کہ "جہنم کا ایک انگارہ بجھ گیا" ۔ امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو کربلا میں شہید کرنے اور انکی عورتوں کو اسیر بنائے جانے کی خبر جب

شام میں پہنچی تو وہ اس بات پر یقین کیے بیٹھے تھے کہ کربلا میں مارے جانے والے بے دین ، کفار مکّہ تھے۔

اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے روشن چہرے کیسے شک اور ارتیاب کی گرد میں چھپا دیے گئے۔ جب امام علی ابن ابی طالب اور ان کی اولاد کی تاریخ کو مشکوک بنادیا گیا ہو وہاں ان کے پیروکاروں کے چہروں پر کیسے کیسے تاریک اور دبیز پردے نہ ڈالے گئے ہوں گے۔

میں ایک مرتبہ پھر آپ کو 65 ھجری میں قتل حسین علیہ السلام کا انتقام لینے کے لیے کوفہ کے کبار شیعہ کی قیادت میں اٹھنے والی تحریک کی طرف لیجانا چاہوں گا۔

طبری میں عبدالرحمان خزیمہ کا مشاہدہ ابومخنف کے واسطے سے زکر ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

وہ سب (توابین) قبر امام حسین علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ وہ سارا مجمع آہ و بکا کرنے لگا۔ اور میں نے اکثر لوگوں کو یہ خواہش کرتے دیکھا کہ کاش وہ امام حسین اور ان کے اصحاب کے ساتھ شہید ہوجاتے۔ سلیمان بن صرد الخزاعی امام حسین علیہ السلام کی قبر پر یہ دعا پڑھ رہے تھے

" اے اللہ حسین شہید ابن شہید، صدیق ابن صدیق ، مہدی ابن مہدی پہ رحم فرما۔ اے اللہ میں آپ کو گواہ بنا کے کہتا ہوں کہ میں حسین ابن علی ، علی ابن ابی طالب کے دین پر ہوں۔ ان کے راستے کا راہی ہں۔ ان کے دشمنوں کا دشمن ہوں اور ان کے محبوں کا محب ہوں"

عبدالرحمان خزیمہ کہتے ہیں کہ اس دن انہوں نے قبر حسین علیہ السلام پر لوگوں کی ویسے ہی بھیڑ دیکھی جو حجر اسود کے گرد جمع ہونے والی بھیڑ جیسی تھی۔

عبدالرحمان بن وائل نے قبر حسین کے پاس کھڑے ہوکر کہا"اللہ کی قسم میرا گمان ہے کہ حسین علیہ السلام ، ان کے بابا علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور ان کے بھائی امام حسن افضل امت ہیں۔

اس تحریک کے تحت جو لشکر ترتیب پایا اس نے اپنا رخ شام کی طرف کیا۔ ان ک شام کا رخ کرنا بتاتا ہے کہ وہ سب اچھے سے سمجھتے تھے کہ قتل حسین کے ذمہ دار کون ہیں ۔ عین الوردہ کے مقام پر شام سے آنے والے لشکر سے ان کا مقابلہ ہوا اور شامی لشکر سے لڑتے ہوئے اس لشکر کے قائد سیلمان بن صرد الخزاعی رضی اللہ عنہ ترانوے سال کی عمر میں جام شہادت نوش کرگئے۔ ایک بار پھر کوفہ کے ہزاروں شیعان علی ابن ابی طالب نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا-

اس معرکے میں شہید ہونے سے بچ گئے انھوں نے پھر بنوامیہ کی اسٹبلشمنٹ کے خلاف تحریک منظم کرنے کی ٹھان لی ۔ ایک بار پھر کوفہ ہی اس خفیہ تحریک کا

مرکز تھا۔ اور آگے چل کر اس تحریک کی قیادت ایک اور شہید صحابی رسول اللہ ﷺ کا بہادر بیٹا جس کی زندگی کوفہ میں امام علی ابن ابی طالب اور ان کے جید صحابی ساتھیوں کی صحبت میں گزری تھی ۔ جس نے جنگ جمل سے جنگ صفین و نھروان میں اپنے شباب کے عروج میں حصّہ لیا تھا۔ اس کا نام مختار ثقفی تھا۔ اس کا نعرہ بھی " آؤ خون حسین کا انتقام لیں" تھا ۔

میں اوپر امیر شام کے دو خطوط کے متن کا ذکر کرچکا ہوں اور اپنے طور پر یہ بتا چکا ہوں کہ اگر ہم ابتدائی عرب روایت تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ابتدائی مسلم تاریخ میں مسئلہ تفضیل اجمالی شکل سب سے پہلے قرآن مجید میں ذکر ہوا ۔

جس میں اجمالی طور پر یہ بتایا گیا کہ فتح مکّہ کے بعد حجاز میں مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو مہاجرین اور انصار کا تھا جن کو قرآن السابقون الاولون کہتا ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ تھا جو صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوا۔ ان میں پہلے گروہ کو دوسرے گروہ پر سبقت اور برتری کا قرآن نے خود اعلان کیا۔ اور دوسرے گروہ میں سے جو پہلے گروہ کی نیکی میں پیروی کرے گا اس سے بھی حسن جزا کا وعدہ کیا گیا۔ اسی طرح قرآن پاک میں اہل بیت سے رجس دور کرکے ان کو طاہر و مطہر قرار دیا۔ اور پھر اسی قرآن میں آیت مباہلہ ہے جس میں پانچ تن مشخص ہوئے اور پنجتن کہلائے۔

پھر یہ مسئلہ ہمیں تاریخ اور کتب احادیث میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی روایات میں نظر آتا ہے۔ آپ نے فتح خیبر کے موقعہ پر امام علی ابن ابی طالب کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا مرکز قرار دیا۔ ایک موقعہ پر آپ نے علی ابن ابی طالب کے اپنے ساتھ رشتے کی وضاحت موسی و ہارون کے درمیان رشتے سے کی ۔ ایک موقعہ پر آپ نے خود کو علم کا شہر اور علی ابن ابی طالب کو اس کا دروازہ قرار دیا۔ اور تمام کتب سیر و احادیث و اخبار سے یہ پتا چلتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری حج سے واپسی کے بعد آپ نے مقام غدیر خم پہ امام علی ابن ابی طالب کو مومنین کا ویسے ولی قرار دیا جیسے آپ پیغمبر مومنین کے ولی تھے۔ اور جب آپ مدینہ پہنچے تو اپنی وفات سے پہلےآپ نے صحابہ کرام کے اجتماع میں قرآن اور اپنی عترت دونوں سے وابستہ رہنے کی نصحیت فرمائی ۔ آپ نے اپنے اہل بیت کے بارے میں تین بار صحابہ کرام کو ڈرتے رہنے کا حکم صادر فرمایا۔

اس کے بعد سبقت اور قرابت کو ہم نیابت رسول اللہ ﷺ سے جوڑنے کا عمل مہاجر صحابہ کرام کی ایک جماعت کی طرف سے دیکھتے ہیں جن کی سربراہی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق ، عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنھم کررہے تھے۔ یہ انصار میں قبیلہ خزرج میں بنوساعدہ کے سردار جو عشرہ مبشرہ اصحاب میں سے تھے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے دعوے کے جواب میں بطور دلیل کے سامنے آیا تھا۔

سبقت اسلام اور قرابت رسول اللہ اگر انصار کے مقابلے میں قریش کے مہاجر صحابہ کی بنتی تھی اور وہ اس بنیاد پہ یہ دعوا کررہے تھے کہ امیر امت اسلام جو ہے وہ ان میں سے ہوگا تو ہم نے زھری کے واسطے عروہ بن زبیر اور ان کے واسطے سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی بخاری و مسلم اور دیگرکتب احادیث

میں موجود کتاب الخمس میں وارد حدیث کی روشنی میں دیکھ جگے کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا کہ سبقت و قرابت کے معاملے میں ان کے مقابل اور مماثل کوئی نہیں تھا اور ان سے ہی پوچھا نہ گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہوگئے تھے۔ اور اس موقعہ پہ انھوں نے واضح کیا تھا کہ رسول اللہ کی قرابت والے انھیں اپنی قرابت سے زیادہ پیارے تھے اور پھر انھوں نے مسجد نبوی کے منبر سے "شان علی المرتضی" بھی بیان کی تھی۔ ان آثار ، واقعات اور اخبار سے ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ امام علی المرتضی خود بھی سبق اسلام اور قرابت رسول اللہ ﷺ کے لحاظ سے اپنا مقابل کسی اور کو نہیں دیکھتے تھے۔ ہمیں کہیں امام علی المرتضی علیہ السلام کے اس دعوے کے مدمقابل کسی اور مہاجر قریشی صحابی رسول کا ازخود یہ دعوا نظر نہیں آتا کہ کہ وہ سبقت اسلام یا قرابت رسول اللہ کے اعتبار سے امام علی ابن ابی طالب کے برابر یا ان کے مدمقابل تھے۔

اصحاب جمل میں جو جید مہاجر صحابہ کرام تھے یہاں تک کہ خود حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنھم ان کی رائے میں بھی علی ابن ابی طالب سبقت اسلام اور قرابت رسول اللہ میں سب سے اگے تھے۔

ہمیں امام علی ابن ابی طالب کے مہاجرین صحابہ کرام میں مقام و مرتبہ اور ان کی فضیلت کو سب سے پہلے چیلنج کرنے والے مکّہ مکرمہ کی پرانی قریشی اشرافیہ میں سے زیادہ تر بنوامیہ والے نظر آتے ہیں ۔ اور پھر امیر شام نے ان کے مقام اور مرتبے کو پہلی بار اپنے خط میں چیلنج کیا۔ پہلے خط میں انھوں نے ان کے مقام کو قتل عثمان ابن عفان کا ذمہ دار ٹھہرا کر چیلنج کیا ۔ اور دوسرے خط میں انھوں نے آپ پر

خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنھم سے حسد کرنے کا الزام لگاکر چیلنج کیا اور اسی خط میں انھوں نے خود سے اصحاب میں فضیلت کی درجہ بندی کی اور خلفائے ثلاثہ کو باالترتیب باقی اصحاب سے افضل قرار دیا اور اس خط میں کہیں انھوں نے ان کے بعد امام علی ابن ابی طالب کو چوتھے نمبر پہ بھی باقی اصحاب سے افضل قرار نہیں دیا۔

میں چاہتا ہوں کہ جیسے میں نے امیر شام کے مذہبی بیانیہ کو ان کے خطوط کا متن درج کرکے واضح کیا، ویسے ہی میں امام علی ابن ابی طالب کے مذہبی بیانیہ کو بھی ان کے امیر شام اور عمرو بن العاص کے نام خطوط کا متن کے اہم مقامات کا ذکر کرکے واضح کردوں۔

آپ نے معاویہ ابن ابی سفیان کو پہلا کا خط مدینہ سے لکھا تھا –عبداللہ ابن رافع سے یہ خط انہوں نے لکھوایا تھا

فانہ ان کان عثمان ذا حق و قرابۃ فانا ذوحق و قرابۃ ایضا الا و ان اللہ قلدنی امر الناس عن مشورۃ من المہاجرین والانصار – الا و ان الناس تبع لھم فیما راوا و عملوا و احبّوا و کرھوا فالعجل عليّ ثم العجل !فانی قد بعثت الی الجمع العمال لاعھد الیھم ---------

میں نے انعقاد خلافت علی ابن ابی طالب کی بحث کے دوران تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ کیسے صفر کے مہینے میں اس خط کا جواب خالی کاغذوں کی صورت مدینہ پہنچا تھا اور اس پہ علی ابن ابی طالب نے شام پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کردی تھی جس سے اکثر قریشیوں نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

پہلا خط علی ابن ابی طالب کو امیر شام نے جو لکھا وہ انھیں کوفہ میں موصول ہوا تھا۔ اس خط کی زبان کافی سخت تھی تو جواب میں علی ابن ابی طالب نے وہی انداز اپنایا ۔ انھوں نے لکھا

فانی قاتل جدک و خالک و اخیک والسیف الذی قتلتھم بہ معی۔ لم استبدل باالسیف سیفا و لا بغیر اللہ ربا ولا بغیر النبی نبیا۔فافعل ما شئت ۔ ستجدنی بطلا شدیدا ، اقاتل کل جبار عنید۔ والسلام

تیسرا خط امام علی المرتضی نے جریر بن عبداللہ کے ہاتھ دیکر شام بھیجا تھا جس کا متن خلاصہ کے ساتھ میں لکھ چکا۔

امیر شام نے امام علی ابن ابی طالب کو جو چوتھا خط بھیجا تھا وہ ابومسلم خولانی کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اور اسی خط میں انھوں نے مسئلہ فضیلت کو چھیڑا تھا- اس خط کے جواب میں امام علی ابن ابی طالب نے جو خط لکھا اس میں مسئلہ تفضیل پہ ان کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں

ولعمری انی الارجو اھا اعطی اللہ الناس علی قدرھم فضائلھم فی الاسلام و نصحیتھم للہ و لرسلہ ان یکون سھمنا فی ذالک اھل الببت اوفر نصیب ان مُحَّمدا صلی اللہ وعلی آلہ وسلم لمّا دعا الی الایمان باللہ و التوحید لہ کنا اہل البیت اول من امن بہ و صدق فی ما جا فبتنا احوالا کاملۃ محرمۃ تامۃ وما یعبد اللہ فی ربع ساکن من العرب غیرنا

میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں پورے یقین کے ساتھ امید ہے کہ جب اللہ پاک لوگوں کی اسلام میں فضیلت اور اللہ واس کے رسول اللہ کے لیے ان کی خیرخواہی کے اعتبار سے درجے مقرر کرے گا تو ہم اہل بیت میں اس کا سب سے بڑا حصّہ آئے گا کیونکہ جب رسول اللہ نے اللہ پہ ایمانے لانے و توحید کی طرف بلایا تو ہم اہل بیت سب سے پہلے ان پہ ایمان لائے اور ان کے بارے میں جو آیا اس کی صدیق کی تو راتوں رات ہمارے احوال کامل ہوگئے اور مکمل عزت والے ہوگئے اور بستی میں رہنے والوں میں ہمارے سوا کسی نے عربوں میں اللہ کی عبادت نہ کی۔

امام علی ابن ابی طالب کے اس جواب سے فضیلت کے اور قدر کے معاملے میں ان کا مذہبی بیانیہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآن ، احادیث اور اخبار کا جائزہ لیں تو فضلیت اور قدر میں وہ انفرادی شخص سے زیادہ گروہی شناخت کو اہمیت دیتے نظر آتی ہے اور علی ابن ابی طالب کا رویہ بھی گروہی فضیلت کی طرف ہی ہے۔ اور یہاں ہم صاف دیکھتے ہیں کہ امام علی ابن ابی طالب اہل بیت کو باقی اولین مسلمانوں سے الگ کرکے دیکھتے ہیں۔

جنگ نہروان جب ختم ہوجاتی ہے اور حضرت علی ابن ابی طالب کوفہ واپس آجاتے ہیں تو ایسے میں حضرت حجر بن عدی،حضرت عمرو بن الحمق اور عبداللہ بن وہب الراسی آپ کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں ۔ اس ملاقات کے دوران یہ قرین قیاس بات ہے کہ اور لوگ بھی ہوں گے۔ اس مجلس میں وہ دیگر سوالوں کے ساتھ حلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنھم کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے موقعہ پہ جب آپ شام پر فیصلہ کن حملہ کرنے کی ٹھان چکے تھے تو خلفاء سابقین اور صحابہ کرام کے درجات اس جیسے دوسرے سوالات کو اٹھانے کا مقصد کیا

تھا؟ ایک ہی مقصد تھا کہ آپ کی حکومت میں رہنے والوں کے خیالات کو منتشر رکھا جائے۔ عدم اتفاق کو بڑھایا جائے اور کسی بھی صورت آپ کو شام پر حملہ کرنے سے روکا جائے۔ اور آپ کے ساتھ نہ دینے والوں کی طرف سے یہ کوشش مسلسل ہورہی تھی ۔ مدینہ سے آپ کو شام پر فیصلہ کن حملے سے روکنے کی کوشش ہورہی تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ جب آپ نے کوفہ میں قدم رکھا تو آپ کی ولایت کا انکار کرنے کے لیے واقعہ غدیر خم کو جھٹلانے کی کوشش ہوئی ۔ اور آپ نے جنگ صفین کی تیاری کے دوران مسجد کوفہ کے سامنے میدان الرحبہ میں اور کوفہ کے گرد و نواح میں آپ نے اجتماعات منعقد کرکے اپنی ولایت کی قسم اس واقعے کے اس وقت موجود گواہوں سے گواہی لی تھی۔

جنگ صفین میں عمار بن یاسر کی شہادت سے ثابت ہوگیا تھا کہ حق کس طرف ہے۔ لیکن اس معاملے پہ بھی تاویل کا بازار گرم کیا گیا اور عمار بن یاسر کا قتل بھی تاویل سے لشکر علی ابن ابی طالب کے سر منڈھ دیا گیا۔

جب کنفیوژن پیدا کرنے والے بہت سارے معاملات اکٹھے ہوگئے تو آپ نے ایک مفصل خط لکھوایا۔ تاریخ میں اس خط کا نام ہے " اپنے شیعہ کی طرف "

اس خط میں گویا آپ نے اپنا پورا فہم تاریخ اسلام ہی کوفہ کے شیعان علی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ یہ سب سے زیادہ تفصیلی خط ہے۔ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط جملہ معاملات پہ ہم امام علی ابن ابی طالب کی رائے پاتے ہیں

بعثت رسول اللہ ﷺ

بے شک اللہ نے محمّد ﷺ کر تمام جہانوں کے نذیر، اپنی کتاب کا امین اور اس امت پر اپنا گواہ بناکر بھیجا

عربوں کی حالت

اے گروہ عرب تم بے دین تھے، برے حال میں تھے، ایک دوسرے کا خون بہاتے، اپنی اولاد کو قتل کرتے ،قطع رحم کرتے اور ناحق ایک دوسرے کا مال ہضم کرجاتے۔

اللہ کا احسان

بے شک اللہ نے تم پہ مہربانی کی – تمہاری طرف تمہاری ہی زبان کے حامل محمّد کو رسول اللہ بناکر بھیج دیا۔جس کے بعد ایمان لے آئے۔ وہ تم میں سے تھے، تمہی میں رہے۔ تمہیں ان کی عزت اور نسب دونوں سے اچھے سے واقفیت تھی۔ انھوں نے تمہیں کتاب اللہ، سنت اور فرائض کی تعلیم دی۔

رسول اللہ کی نصحیت

اللہ کے رسول نے تمہیں صلہ رحم ملحوظ رکھنے ، خون ریزی سے بچنے ،اپنی ذات کی اصلاح کرنے ، امانتیں ان کے اہل کو لوٹانے کی تاکید کی ۔ تمیں حکم دیا کہ ایک دوسرے سے مہربانی کے ساتھ پیش آؤ،ایک دوسرے کی دست گیری کرو،ایک دوسرے پہ ترس کھاؤ —

انھوں نے تمہیں ظلم، حسد، دشنام طرازی، سرکشی کرنے سے منع کیا- شراب نوشی کو حرام قرار دیا۔ کم ناپنے اور کم تولنے سے روکا۔ اور تمہارے سامنے اللہ کا یہ کلام رکھا "نہ زنا کرو،یتیموں کا مال ناحق مت کھاؤ، ہر اس نیک کام کی ترغیب دی جو تمہیں نار جہنم سے دور کردے اور ہر اس برے کام سے روکا جو تمہیں جنت سے دور کرتا ہو۔

وفات رسول اللہ

جب اللہ کے رسول ﷺ کی مدت مکمل ہوگئی تو اللہ نے ان کو اپنے پاس بلالیا۔ آپ کوشش مشکور، آپ اعمال سے اللہ راضی اور آپ کی ہرگھڑی پچھلی گھڑی سے زیادہ بلند مقام پر لیجانے والی ہے۔ اللہ کے ہاں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

فیالموتہ مصیبۃ خصّت الاقربین و عممت المومنین

بے شک آپ کی وفات آپ کے اقربا کے لیے خصوصی طور پر ایک آزمائش تھی اور عام ایمان والوں کے لیے بھی یہ آزمائش تھی

تنازع خلافت

جب آپ اس جہان سے چلے گئے تو آپ کے بعد مسلمان "امارت" کے مسئلے میں تنازع میں پڑگئے۔

فواللہ ما کان یلقی فی روعی ، ولا یخطر علی بالی ان العرب تعدل ھذا الامر عنّی

اللہ کی قسم نہ تو میرے دماغ میں ایسی سوچ آئی اور نہ ہی میرے دل میں ایسا کھٹکا ہوا تھا کہ عرب امارت کو میرے سے ہٹاکر کسی اور کو دے ڈالیں گے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت

مجھے بڑا تعجب ہوا، جب میں نے یہ دیکھا کہ لوگ (حضرت) ابوبکر(صدیق رضی اللہ عنہ) کی بیعت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ لیکن میں رکا رہا ۔ کیونکہ میری رائے یہ تھی جس فرد کو میرے امور کا حاکم مقرر کیا گیا ہے اس کی نسبت میں نیابت مُحَمَّد ﷺ کا زیادہ حق دار تھا۔ جب تک اللہ نے چاہا میں رکا رہا۔ پھر جب میں نے یہ دیکھا کہ بہت سارے لوگ دین مُحَمَّد ﷺ سے پھر رہے ہیں اور وہ اسے اور ملت

ابراہیم کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں تو مجھے یہ ڈر ہوا کہ اگر میں نے اب بھی اسلام اور اہل اسلام کی نصرت نہ کی تو مجھے اسلام میں رخنے اور شکست و ریخت دیکھنا پڑے گی اور یہ مصبیت میرے لیے مجھے ولایت و امارت نہ ملنے سے کہیں زیادہ بڑی ہوگی جو بہت ہی قلیل مدت کے لیے متاع کی حثیت رکھتی ہے۔ اور پھر یہ ایک دن ایسے زائل ہوجائے گی جیسے سراب زائل ہوجاتا ہے۔ تو میں فوری طور پر چل کر ابوبکر کے پاس آیا اور ان کی بیعت کرلی۔ ان کے دوش بدوش ان حوادث کو مٹانے کے لیے کام شروع کردیا۔ یہاں تک کہ باطل مٹ گیا اور کافروں کی خواہش کے برعکس اللہ کا کلمہ بلند تر ہوگیا- پس ابوبکر امور میں حاکم بنے، انھوں نے لوگوں سے نرمی برتی، انھیں سیدھے راستے پر چلایا – میں خیرخواہی کے امور میں بطور ناصح ان کے ساتھ رہا، اللہ کی اطاعت والے امور میں ان کے ساتھ چلا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت

جب ان کا وقت قریب آگیا تو انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو امیر نامزد کردیا۔ پس ہم نے ان کی بات سنی ، کتاب اللہ اور سنت رسول کی پیروی کی ، ان کی بیعت کی ، ان کو اچھے مشورے دیے-وہ اچھی سیرت کے مالک رہے اور اپنے نفس کو بھی سنبھالے رہے-

خلافت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ

جب ان کا وقت آیا تو مجھے خیال تھا کہ اب یہ امارت میرے سے کہیں اور نہیں جائے گی ۔ لیکن انھوں نے شوری بنائی ۔ مجھے ان چھے میں چھٹا رکن بنادیا۔ ان اہل شوری کو میری امارت سے زیادہ ناپسندیدہ کسی اور کی امارت ہو نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ان کو میری بات ماننا پڑتی اور میں تو جس رائے کو حق سمجھتا اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی بحث کرنے سے نہیں ہٹتا تھا۔ تو میں نے ان سے کہا

اے گروہ قریش! جب تک ایک آدمی بھی قرآن کا قاری ہے اور سنت کا واقف ہے اس وقت تک میں تم سب سے زیادہ اس امارت کا حق دار ہوں۔ وہ سب اس بات سے ڈر گئے کہ اگر میں امیر ہوا تو اس میں ان کا تو کوئی حصّہ نہیں رہے گا۔ اس لیے انھوں نے اتفاق کرلیا کہ مجھے چھوڑ کر وہ کسی کو بھی امیر مقرر کرلیں۔ تو انھوں نے امارت حضرت عثمان ابن عفان کو دے دی۔ اور مجھے اس امید پر امارت سے خارج کردیا کہ جب کبھی وہ اس امر سے مایوس ہوں گے تو اس طرح آپس میں اسے منتقل کرلیا کریں گے۔ پھر مجھ سے کہا کہ آؤ عثمان رض کی بیعت کرو،دوسری صورت میں ہم آپ سے لڑیں گے۔

فبایعت مستکرھا و صبرت محتسبا (تو میں نے با دل نخواستہ بیعت کی اور حسبۃ للہ صبر کیا)

فقال قائلھم : انک یا ابن ابی طالب علی الامر لحریص "، قلت لھم: انتم احرص ، اما انا ازا طلبت میراث بن امّي و حقہ وانتم دخلتم بینی و بینہ و تصرفون وجھی دونہ (پھر ان میں سے کہنے والوں میں سے ایک کہنے والے نے تو مجھے یہاں تک کہہ دیا،اے ابی

طالب کے بیٹے تم تو امارت کے بہت حریص ہو۔" میں نے ان کو کہا کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ حریص ہو۔ میں تو اپنے بھائی کی میراث اور اس کا حق طلب کررہا تھا اور تم اس میراث اور اس کے حق کے درمیان دخیل ہوگئے اور مجھے اس سے دور ہٹانے لیے ہو۔

رجوع الی اللہ

اے اللہ قریش کے مقابلے میں ،میں آپ سے ہی مدد مانگتا ہوں ۔ بے شک ان لوگوں نے مجھ سے قطع رحمی کرلی اور میرے مرتبے اور فضیلت کو بہت زیادہ گھٹادیا۔ اور میرا وہ حق چھیننے کے لیے باہم جمع ہوگئے جس کا میں ان سے کہیں زیادہ حقدار ہوں۔

ثم قالوا: اصبر کمداوّعش متاسفا۔" (پھر کہنے لگے : غم جھیلو اور افسوس میں زندگی بسر کرو)

دور خلفائے راشدین ثلاثہ

فنظرت فاذا لیس معی رفاقۃ ولا مساعد الا اهل بیتی فضننت بهم عن الهلاک فاغضیت عینی عن القذی و تجرعت ریقی علی الشجی و صبرت من کظم الغیظ علی امرمن العلقم طعما و آلم للقلب من حر الحدید حتی اذا نقمت علی عثمان اتیتموه فقتلتموه

پس میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے اپنے اہل بیت کے سوا نہ کوئی اپنا رفیق نظر آیا نہ ہی کوئی ہمدرد۔ میں نے اپنے اہل بیت کو ہلاکت سے بچایا اور اپنی آنکھوں کوحس و خاشاک سے بچا لیا۔(یعنی آنکھیں بند کرلیں) اور اس غم پر لعاب دہن پی کر رہ گیا-اور ایسے امر پر اپنے غصّے کو پی گیا جو حنظل کے پھل سے زیادہ تلخ تھا اور گرم لوہے سے زیادہ دل کو تکلیف پہنچانے والا تھا۔ پھر تم نے حضرت عثمان ابن عفان پر عیب لگائے ، ان پر چڑھ دوڑے اور ان کو قتل کردیا۔

انعفاد خلافت علی ابن ابی طالب علیہم السلام

پھر تم سب مل کر میرے پاس آئے۔ میں تمہاری اور تم نے میری بات نہ مانی ۔اس پہ تم مجھ سے جھگڑنے لگے ۔ میں نے تم سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا۔ پھر تم سب مجھ پہ ایسے ٹوٹ پڑے جیسے کہ تم ایک دوسرے کو یا مجھے قتل کردو گے۔ تم نے مجھے کہا کہ ہم کے سوا کسی کو قابل نہیں پاتے۔ آپ کے سوا کسی اور پر رضامند نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ہم سے بیعت لے لیں۔ تم نے اوروں کو بھی میری بیعت کی دعوت دی- تو جس نے برضا و رغبت میری بیعت کی میں قبول کرلی اور جس نے انکار کیا اسے چھوڑ دیا۔

جنگ جمل

سب سے پہلے جس نے میری بیعت کی وہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما تھے۔ اگر وہ بھی میری بیعت نہ کرتے تو میں ان کو بھی مجبور نہ کرتا اور دوسروں کی طرح چھوڑ

دیتا۔ پھر وہ کچھ روز اسی طرح رہے ۔ بعد میں مجھے خبر ملی وہ ایک ایسا لشکر لیکر بصرے کی طرف چلے گئے جس میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے میری اطاعت کا عہد نہ کیا ہو اور میری بیعت نہ کی ہو۔ پھر وہ بصرہ میں میرے عمال ، بیت المال کے خزانوں اور ان شہریوں پر چڑھ دوڑے جو میری اطاعت اور بیعت کیے ہوئے تھے۔ وہ میرے شیعہ پر بھی چڑھ دوڑے۔ ان کی جماعت پراگندہ کرڈالی، اور میری حامی جماعت میں انتشار پھیلایا۔ پھر میرے شیعہ/ساتھیوں پہ جڑھ دوڑے، ان میں سے کچھ کو دھوکے سے مارا، کچھ قید کرکے ختم کیا اور کچھ کو اپنی تلواروں سے مار ڈالا۔ بس وہ غریب صبر اور نکی کے اجر کی امید میں اللہ سے جا ملے۔ خدا کی قسم اگر وہ ان میں سے فقط کسی ایک آدمی کو بھی بے گناہ قتل کرتے تو میں لیے ان کے پورے لشکر کو قتل کرنا جائز ٹھہرتا۔ مگر انھوں نے تو اپنے سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو قتل کرڈالا۔ خدا ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائے اور ظالموں کو کو دھتکار دے۔

امیر شام نے مسئلہ تفضیل کو جیسے بیان کیا ویسا بیان ہمیں کسی اور مہاجر صحابی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ خود امام علی ابن ابی طالب نے اس خط کے جواب میں مسئلہ تفضیل پہ جو بیانیہ مرتب کیا اس میں انھوں نے مہاجر و انصار صحابہ کو ایک طرف اور بنوہاشم کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ان کو دوسری طرف رکھا۔ اور مثال دی

کہ جب مہاجر و انصار صحابہ میں کوئی شہید ہوتا تو اس کے نماز جنازہ پر پانچ یا سات تکبیریں اور بنو ہاشم میں سے شہید ہونے والے کی نماز جنازہ پر ستر تکبیریں پڑھنے کو بطور تحدیث نعمت بیان کیا۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنے میں تو آسانی ہوجاتی ہے کہ امام علی ابن ابی طالب کے نزدیک قرابت رسول اللہ ﷺ ، خانوادہ نبوت کی افضلیت بمقابلہ مہاجر و انصار صحابہ سے زیادہ تھی ۔ اور آپ نے ساتھ ہی اپنی فضیلت کے باب میں یہ کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اس معاملے پہ بھی تفصیل سے اخبار کا ڈھیر لگاسکتے ہیں۔

اہل شام اور جنگ صفین

پھر میں نے اہل شا پر نظر ڈالی تو وہ اطراف و جوانب کے نرے گنوار، لالچی، نادان اور کمینے معلوم ہوئے جو ادھر ادھر سے آکے اکٹھے ہوگئے تھے۔ وہ تو اس لائق ہیں کہ ان پر حاکم مقرر کرکے ان کی تادیب و تربیت ، نگرانی اور روک تھام کی جائے۔ نہ وہ مہاجرین میں سے ہیں نہ ہی انصار میں سے۔ نہ مہاجروں و انصار کی نیکی کے ساتھ اتباع کرنے والے ہیں۔ مجھے ان پر چڑھائی کرنا پڑی۔ میں نے انھیں پہلے اطاعت اور جماعت میں داخل ہونے کی نصحیت کی ۔ جس سے انکار انھوں نے کیا اور تشت و افتراق پر جمے رہے۔ مہاجرین و انصار اور تابعین بالاحسان کے مقابلے پر آکر انھیں تیر اور نیزوں سے زخمی کرنے لگے۔ اس پر میں بھی جلد ہی مقابلے پر آگیا اور ان کے مقابل فوجیں کھڑی کیں اور جب ہمارے حملے سے انھیں شکست صاف نظر آنے لگی تو وہ نیزوں پہ قران لے آئے اور احکام قران سے فیصلے کی مانگ کرنے لگے۔جب انھوں نے تمہیں قرآن کی دعوت دی تو میں نے تمہیں اس وقت بھی خبردار کیا تھا

انھم لیسوا باصحاب دین ولا قرآن و انما رفعوھا الیکم خدیعتو میکیدۃ

بے شک نہ وہ دین دار ہیں اور نہ ہی اہل قرآن ہیں ۔ اور انھوں نے تمہیں دھوکہ دینے اور چال چلنے کے اسے بلند کیا ہے

واقعہ تحکیم

لیکن تم نے میری بات ماننے کی بجائے مجھے ہی الزام دیا اور مجھے ان کی پیش کش قبول کرنے کو کہا۔ اور کہا کہ اگر انہوں نے قرآن کا حکم مان لیا تو وہ حق پر ہمارے ساتھ ہوجائیں گے۔ اور اگر نہ مانا تو یہ ہی بات ہماری طرف سے ان پر حجت ہوجائے گی ۔ اس پر مجھے ان کی بات ماننی پڑی اور میں نے لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔ طے یہ پایا کہ دو ثالث چنے جائیں گے۔ اور وہ وہ حکم باقی رکھیں گے جسے قرآن نے باقی رکھا اور اسے مٹائیں گے جسے قرآن نے مٹایا۔ لیکن ثالثوں کی رائے میں اختلاف ہوا اور دونوں نے الگ الگ راہ اختیار کرلی ۔ دونوں نے جو قرآن کا حکم تھا اسے پس پشت ڈالا دیا-جو قرآن میں تھا اس کے برخلاف کیا اور اللہ نے اس سبب ان کو سیدھے راستے سے ہٹادیا۔اور وہ اسی کے مستحق تھے۔

خوارج

اس پہ ایک گروہ ہم سے الگ ہوگیا ۔ ہم نے بھی ان کو چھوڑ دیا جب تک وہ اپنے حال پہ رہے۔ پھر جب انھوں نے فساد کرنا اور ہمارے ساتھیوں کو شہید کرنا شروع کردیا تو ہم ان کے پاس گئے اور ان سے اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرنے کی مانگ کی لیکن وہ اڑے رہے تو ہم نے ان سے سخت مقابلہ کیا اور ان کو شکست فاش دے دی ۔

اہل کوفہ

پھر میں نے تمہیں دشمنوں کا بنا دیر کیے پیچھا کرنے کو کہاتاکہ اس سے ان کے دل دہل جائیں۔ مکر اور فریب کا پردہ چاک ہوجائے۔اس پہ تم (اشراف القبائل اور کئی اور مخلص شیعان علی سے ہٹ کر تھے)نے کہا تمہاری کلائیاں تھک چکی ہیں۔ تلواریں کند ہوچکی ہیں۔ تیر ختم ہوگئے ہیں اور نیزوں کے بورے ڈھیلے پڑ گئے۔ اب آپ ہمیں اجازت دیجیے ہم پلٹ جائیں اور اچھی سی تیاری کرکے واپس آئیں۔ جب واپس آئیں تو جتنے ساتھی شہید یا زخمی ہوئے ہیں اور ہم سے جدا ہوگئے اتنے ہی اتنے ہی جنگ باز اور لے آئیں۔ کیونکہ دشمن کے مقابلے میں یہی ہماری قوت ہے۔ پھر جب تم کوفہ واپس آئے اور سامنے میدان میں پڑاؤ ڈالا تو میں نے تمہیں چھاؤنی میں رہنے کا حکم دیا اور کہا اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں سے مل لو۔ جہاد پر مستعد ہوجاؤ۔ بیوی بچوں سے مت ملو –اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہوگی اور تم نرم و مہربان بن جاؤ گے---------------

تمہیں پتا ہے کہ تمہاری جنگ کن لوگوں سے ہے؟ تمہاری جنگ طلقاء اور ان کی اولاد سے ہے جو مجبور ہوکر اسلام لائے تھے اور اس سے پہلے ہمیشہ رسول اللہ سے لڑتے رہے۔ جو قرآن و سنت دونوں کے دشمن ہیں۔ اہل احزاب و بدع و احداث ہیں۔

یہ خط امام علی بن ابی طالب کی طرف سے اسلام کی پہلی صدی ہجری میں مابعد جنگ نہروان تک کی مختصر مگر جامع تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اس خط میں

انھوں نے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ان واقعات کا ہمیں دیگر اسانید سے مروی ہونے والی روایات اور اخبار سے بھی پتا چلتا ہے۔ اس خط کے آخر میں امام علی کوفہ والوں کے کردار بارے بھی جامع تبصرہ فرماتے ہیں

انتم علی مافیکم من تخاذل و تواکل خیرمنھم و اھدی سبیلا

تم لوگوں میں سے کئی اگرچہ نااتفاقی اور بے عملی کا شکار ہیں لیکن ان لوگوں سے کہیں بہتر اور ہدایت والے راستے پر گامزن ہو ۔

فیکم الحکماء والعلماء والفقھاء و حملۃ القرآن و المجتھدون بالاسحار والعباد والزھاد و عمار المساجد واھل التلاوۃ القرآن

تم میں حکماء، علماء ، حفاظ قرآن، تہجد گزار ، عباد ، زھاد ، نمازی، قاری قرآن ہیں۔

افلا تسحطون و تنقمون ان ینازعکم الولایۃ علیکم سفھاوکم والارزال و الاشرارکم

کیا تمہیں یہ گراں نہیں گزرتا اور کیا تمہیں یہ بات ناگوار نہیں گزرتی تم میں یہ احمق، رزیل اور شریر لوگ حکومت چھیننا چاہتے ہیں –

سیاق و سابق سے ہم یہ بات جان سکتے ہیں کہ امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام جب یہ خطبہ دیا تو وہ چاہتے تھے کہ مزید کسی تاخیر کے اہل شام کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی جائے۔ اس وقت تک جو کوفہ میں اشراف القبائل تھے ان میں سے اکثر سردار شام جنگ کے لیے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اشعث نے صفین کی جنگ میں جب فتح و نصرت قریب تھی تھکاوٹ کا بہانہ کرکے لڑنے سے انکار کردیا تھا۔ واقعہ تحکیم کے بعد امام علی کے لشکر میں جن لوگوں پر ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کا اثر تھا انہوں نے بھی لڑنے سے گریزپائی کا رویہ اختیار کرلیا تھا۔ اس وقت کوفہ میں آپ کے مخلص شیعہ ہی تھے جو آپ کے کہے پرعمل کررہے تھے۔ ہمیں پتا ہے کہ مالک الاشتر اور ان کے ساتھی ایسے ہی لوگوں میں تھے جو جنگ بند کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

واقعہ تحکیم کے تحت دوسری مرتبہ جو اجتماع ازراح کے مقام پر ہوا تھا اس مقام سے پہلے جب صفین کے مقام پر جو اجتماع ہوا تھا اسی وقت خوارج آپ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے لیکن ازراح کے مقام پر جو اجتماع ہوا اس موقعہ پر کوفہ کے کئی اشراف القبائل اور قریش سے تعلق رکھنے والے کوفہ میں قیام پذیر لوگ بھی یا تو غیر جانبدار پوزیشن اختیار کرگئے یا وہ خفیہ طور پر امیر شام سے رابطے میں آگئے – اور اسی دوران امیر شام نے عراق اور یمن کے گرد و نواح میں چھاپہ مار کاروائیاں شروع کردیں تھیں۔

یہ 39 ھجری کا سال تھا۔ امام علی ابن ابی طالب کوفہ میں شامیوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے لشکر کی تیاری کررہے تھے۔ وہ عراق میں پائے جانے والے انتشار

اور عدم اتفاق کو دور کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ کہ امیر شام نے نعمان بن بشیر کو دو ہزار افراد کا لشکر دے کر عین التمر کی طرف بھیجا تھا۔ وہاں مالک بن کعب الارحبی تھے جنھوں نے نعمان بن بشیر کے حملے کا مقابلہ کیا اور پاس کی مخنف بن سلیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھے وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مالک بن کعب ارحبی کی امداد کو پہنچے اور اس طرح انہوں نے نعمان بن بشیر کے اس حملے کو ناکام بنادیا۔

امیر شام نے دوسرا چھاپہ مار لشکر سفیان بن عوف کی قیادت میں بھیجا جس نے انبار میں قتل و غارت گری مچائی اور جب قیس بن سعد بن عبادہ لشکر لیکر پہنچے تو وہ سفیان بن عوف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرکے فرار ہوچکا تھا۔

امیر شام نے تیسرا لشکر عبداللہ فزاری کی قیادت میں تیما کی طرف روانہ کیا اس نے دیہاتوں میں لوٹ مار کی، قتل و غارت گری کی اور قلعہ پہ قبضہ کرلیا اس کے پیچھے امام علی نے کوفہ سے مسیب بن نخبۃ الفزاری (یہ کبار شیعان علی من الکوفہ میں تھے)کو لشکر دیکر بھیجا اور انھوں نے تیما کو بازیاب کرایا۔ اکثر شامی چھاپہ مار بھاگ گئے۔

امیر شام نے چوتھا چھاپہ مار لشکر ضحاک بن قیس کی قیادت میں واقعہ اور اس کے گردونواح میں بھیجا- ضحاک جہاں سے گزرتا لوگوں کا مال لوٹتا اور امام علی ابن ابی طالب کے حامی دیہاتیوں کا قتل کرتا جاتا۔ ضحاک کے مقابلے میں بھی کوفہ سے ایک لشکر حجر بن عدی کی قیادت میں روانہ ہوا ۔ تدمر کے مقام پر حجر بن عدی کے لشکر نے ضحاک بن قیس کے لشکر کو گھیر لیا اور لڑائی میں بھاری نقصان اٹھاکر ضحاک واپس شام کی طرف بھاگ گیا۔

امیر شام نے پانچواں چھاپہ مار لشکر حجاز اور یمن کی طرف بسر بن ابی ارطاۃ کی قیادت میں بھیجا اور اس نے حجاز اور یمن میں لوٹ مار کی – مدینہ اور مکّہ میں لوگوں سے زبردستی امیر شام کی بیعت لی اورایک بار پھر کوفہ سے جاریہ بن قدامہ السعدی کوفی کی قیادت میں لشکر گیا اور اس کی آمد کا سنکر بسر بن ارطاۃ بھاگ کر واپس شام چلا گیا۔

ان چھاپہ مار جنگوں کو غارات امیر شام کہا جاتا ہے۔ اور ہر غارت کو کوفہ میں جانے پہچانے شیعان علی نے پسپا کیا جس پر میں نے اپنی کتاب "کوفہ: فوجی چھاؤنی سے سماجی – سیاسی تحریکوں کا مرکز بننے تک " کے آخر میں جامعہ کوفہ سے شایع ہونے والے رسالے میں ایک عراقی فاضل کا تحقیقی مضمون کا اردو ترجمہ بطور ضمیمہ شامل کیا ہے۔

اس دوران امام علی ابن ابی طالب مالک الاشتر اور مُحَمَّد بن ابی بکر جیسے جانثار ساتھیوں سے محروم ہوئے اور مالک الاشتر کی شہادت کا آپ کو بہت دکھ تھا۔

پہلی صدی هجری کی عرب روایت تاریخ کے وہ راوی جو بنوامیہ کے دربار اور اموی اشراف کے رفیق بنے انھوں نے مالک الاشتر، مُحَمَّد بن ابی بکر، حکیم بن جبلہ ، عمرو بن الحمق، حجر بن عدی کو بالخصوص اور کوفہ میں کبار شیعان علی ابن ابی طالب کے اکثر جید جانثاروں کو بنوامیہ کی رائے کے مطابق حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعد میں آنے والے مورخین نے تو اس پر

اتفاق دکھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ حضرات قتل عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ بری قرار دیتے رہے۔ حکیم بن جبلہ کہتے تھے کہ وہ ابتدائی محاصرہ کرنے والوں میں شامل تھے لیکن بعد ازاں وہ الگ ہوگئے تھے۔ مالک الاشتر کا کہنا تھا کہ وہ کبھی حضرت عثمان ابن عفان کے گھر کا محاصرہ کرنے والوں میں شامل نہیں رہے۔ محمؐد بن ابی بکر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے لیکن جب حضرت عثمان ابن عفان نے ان کو شرم دلائی تو وہ واپس آگئے۔

امام علی ابن ابی طالب نے کوفہ اور مدینہ سے تعلق رکھنے والی ان جید شخصیات کو اپنے ساتھ رکھا اور ان منسوب ہم کوئی ایسا قول تاریخ میں نہیں پاتے جس کی رو سے ہلکا سا بھی یہ شائبہ ہوتا ہو کہ آپ ان حضرات کو عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی زبان سے ہم ان اصحاب کے لیے محبت بھرے جملوں کو صادر ہوتے دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم تو تاریخ میں یہ پاتے ہیں کہ جب الاشتر شہید ہوگئے تو آپ نے ان کی موت پر گریہ کیا اور ان کی شہادت کے بعد حزن و ملال آپ کے چہرے پر مستقل ہوگیا۔ آپ اشتر کے گھر گئے اور وہاں آپ نے طویل خطبہ ارشاد فرمایا اور اشتر کے ایمان اور عمل میں اخلاص کی گواہی دی ۔

میرے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشتر ہوں، ابن الحمق ہوں ، حجر بن عدی ہوں اور محمؐد بن ابوبکر ہوں ان کے باب میں امام علی ابن ابی طالب کی گواہی زیادہ مستند ہے یا بنوامیہ والوں کی – بنوامیہ والے تو قتل عثمان کا الزام علی ابن ابی طالب پر بھی ڈالتے ہیں تو کیا ان کا یہ الزام سچ مان لیا جائے گا؟ میرے نزدیک علی ابن ابی طالب کی ان اصحاب کے بارے میں جو گواہی ہے اس گواہی کے مقابلے میں کسی اور کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

امام علی ابن ابی طالب کی 40 ھجری کو شہادت ہوجاتی ہے۔ اور اس وقت کہا جاتا ہے کہ وہ 60 ہزار کا لشکر شام پر حملے کے لیے تیار کرچکے تھے۔

اس وقت تک امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاں علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب کی ولادت کو 23 ماہ ہوچکے تھے۔ آپ کی والدہ 38 ھجری میں ہی فوت ہوجاتی ہیں اور آپ کی کوفہ میں پرورش آپ کی پھوپھیوں ام کلثوم اور زینب بنت علی ابن ابی طالب کے ذمہ تھی ۔ اور 40ھجری میں ہی آپ حکومت سے دست بردار ہوئے اور پھر کوفہ سے اپنے جملہ اہل بیت کو لیکر آپ مدینہ منورہ واپس آگئے۔ گویا امیر شام کی مرگ کے وقت آپ کی عمر 22 سال تھی ۔ اور واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر 23 سال تھی ۔

مورخین نے اسیران کربلا کی کربلا سےکوفہ اور کوفہ سے شام تک اور وہاں سے واپسی کا جو راستا ارجح قرار دیا وہ بادیہ الشام کا راستا ہے اور اس بات پہ اتفاق پایا جاتا ہے کہ اسیران کربلا کی واپسی مدینہ کو ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی اور سال تھا 61 ھجری۔

تاریخ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ 61ھجری میں مدینہ واپسی کے بعد امام زین العابدین نے ابتدائی چند سال ویرانے میں خیمہ لگائے رکھا اور وہاں پر آپ عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اور زیادہ وقت شہدائے کربلا کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے تھے۔

شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ابن زبیر کی حکومت کے آخری دو سالوں میں آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے اور جب مدینہ پر چڑھائی ہوئی تو آپ تھوڑے وقت کے لیے پھر دوبارہ مدینہ کے گرد و نواح میں تشریف لے گئے۔ اور پھر مروان کے زمانے سے لیکر ولید بن عبدالملک کے دور میں 94 ھجری تک اپنی وفات کے وقت آپ مدینہ میں ہی محلہ بنو ہاشم میں مقیم رہے۔

امام سجاد نے واقعہ کربلا کے بعد زیادہ وقت مروان اور آل مروان کے دو باشاہوں کا زمانہ حکومت دیکھا۔ اور عام خیال یہ ہے کہ آپ مسجد نبوی میں اپنا مدرسہ بھی عبدالملک بن مروان کے دور میں شروع کیا کیونکہ اس وقت تک قاتلان حسین ابن علی سے انتقام کا دور بھی پورا ہوچکا تھا۔ عبدالملک بن مروان کا دور حکومت 73 ھجری سے شروع ہوا تھا۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ امام سجاد علیہ السلام نے مسجد نبوی میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ 73 ھجری میں شروع کیا تو اس مدرسے کو آپ نے 94 ھجری یعنی 21 سال تک چلایا۔

آپ کے مدرسے میں باقاعدگی سے بیٹھنے والوں میں ایک طبقہ تو ان راویوں کا ہے جنھوں نے آپ سے فقہ اور فروعات میں تو کافی روایات درج کیں لیکن اس نے آپ سے سیاسی واقعات اور بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے مسائل میں بالکل خاموشی اختیار کی یا انہوں نے ان مسائل میں ایسی روایات بنوامیہ والوں سے ہی لیں جس سے بنوامیہ کے موقف کی تائید ہوتی تھی ۔

ان میں آل زبیر اور بنوامیہ کے اشراف کے ساتھ تعلقات رکھنے والے فقہا، محدث، مفسر شامل ہیں۔ ان میں ایک مثال تو مُحَمَّد بن شہاب زھری کی ہے۔ ان کی سیاست کے باب میں ہمیں دو طرح کی روایات ملتی ہیں۔ ایک روایات وہ ہیں جو مُحَمَّد بن شہاب زھری کی بنوامیہ سے تقرب پیدا ہونے سے پہلے کی ہیں اور ان میں ہمیں بنوامیہ کے سیاسی بیانیہ کی مخالفت اور اہل بیت سے شدید تعلق نظر آتا ہے۔ لیکن جب ان کا تعلق بنوامیہ سے بہت زیادہ استوار ہوگیا تو ہمیں ان کی روایات مائل بہ بنوامیہ نظر آنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی زید بن اسلم جو ابتدائی فقہائے سبعہ میں نظر آتے ہیں ان کے ہاں بھی ہم سیاسی معاملات میں جھکاؤ بنوامیہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ عامر بن شراحیل الشعبی بھی ان ہی جیسے لوگوں میں شامل ہیں۔

ایک اہم قابل غور بات یہ ہے کہ مدینہ میں شہاب زھری اور زید بن اسلم و صالح بن کیسان اور کوفہ میں شعبی نے جن مدارس کی بنیاد رکھی ان سب نے اسلام میں صحابہ کرام کی فضیلت کے باب میں بنیادی منہج وہی اختیار کیا جس کا آغاز معاویہ ابن ابی سفیان نے کیا تھا ۔ اس منہج میں تھوڑی سی تبدیلی یہ دیکھنے کو ملی کہ انھوں نے سب سے افضل صحابہ کرام کی ترتیب میں تین خلفاء کے بعد چوتھے خلیفہ علی ابن ابی طالب کو رکھا۔ جبکہ معاویہ ابن ابی سفیان نے اس باب میں ترتیب میں تین خلفائے راشدین کو شامل کیا تھا۔ بعد ازاں اہلسنت کے تیسرے اور چوتھی صدی ھجری کے علماء کی اکثریت نے صحابہ کرام میں سب سے افضل ہونے کی شرط چار صحابہ کرام میں خلافت کو رکھ دیا۔ اور اس حساب سے تو چار کے بعد سب سے افضل صحابی امام حسین علیہ السلام ٹھہرتے ہیں لیکن اس اصول کو امام حسن کے باب میں لاگو نہیں کیا گیا۔

بنو امیہ کے زیر اثر جو سبقت اسلام کا کلیہ تھا اس میں بھی تطبیق کے اصول کو اختیار کرلیا گیا۔ شعبی نے مردوں میں سبقت اسلام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اور بچوں میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دی – جبکہ قرابت رسول اللہ کے اصول میں انہوں نے سسر اور داماد کی نسبتوں ک لحاظ سے چاروں خلفائے راشدین کو برابر قرار دے دیا۔ یہ منہاج برائے فضیلت ہمیں خود امام علی ابن ابی طالب کے بیان کردہ طریقہ کار سے یکسر الگ لگتا ہے۔

اب یہاں ایک اور سوال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کرام میں جن خواتین و حضرات نے امام علی ابن ابی طالب کو رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل قرار دیا تو ان پہ "فیہ تشیع" کا اطلاق کیا گیا۔ لیکن جو حضرات افضلیت کے باب میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق کو قرار دیتے ہیں ان کو کہیں بھی "شیعان ابوبکر صدیق" رضی اللہ عنہ نہیں لکھا گیا۔ اس امتیاز میں کس اصول کو برتا گیا اس کی سمجھ نہیں آتی ۔

امام زین العابدین کے شاگردوں میں کوفہ سے دو اہم شاگرد ہیں ۔ ایک ابان بن تغلب ہیں اور دوسرے ابو حمزہ ثمالی ہیں۔ ابان ابن تغلب کو اکثر محدثین اہلسنت نے ثقہ راوی قرار دیا اور ان پہ کسی نے کذب کا الزام عائد نہیں کیا۔ ابان ابن تغلب کا تعلق کوفہ سے تھا۔ یہ حجر بن عدی کے قبیلہ کندہ سے تعلق رکھتے تھے اور لامحالہ قدیم شیعان علی ابن ابی طالب میں سے کسی شیعہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابان ابن تغلب کو ان کے سیاسی موقف کے سبب "شیعہ" قرار دیا گیا- جرح و تعدیل کے متاخرین نے ان کے بارے میں غالی شیعہ ہونے کی تہمت لگائی ۔ غالی شیعہ کون ہوتا ہے؟ یہ سوال بھی کیا جانا بنتا ہے۔ ابان ابن تغلب غالی شیعہ اس لیے تو قرار نہیں پاگئے کہ

انہوں نے امام علی بن حسین، امام محمؐد باقر اور امام جعفر الصادق سے اہل بیت کے سیاسی بیانیہ کو واضح کرنے والی روایات نقل کی تھیں جو ان کے کئی ایسے شاگردوں کو بیان کرنے کی ہمت نہیں ہوئی جن کو بنوامیہ والوں نے مدینہ کے فقہائے سبعہ میں بھی شمار کیا۔

مجھے شیعان علی ابن ابی طالب کے تاریخی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے بار بار یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ روایت حدیث اور فقہ کے باب میں طبقات کے اول و دوم و سوم میں شامل صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کو ان کے سیاسی بیانیے کے سبب ان کی روایات اس طرح سے شامل نہیں کی گئیں جس طرح سے بنوامیہ اور بنوعباس کے سیاسی بیانیوں کے حامی راویوں کی شامل کی گئیں۔ امام سجاد علی بن حسین کے ان شاگردوں کے ساتھ بھی یہی ہوا جو شیعان علی ابن ابی طالب کہلائے۔

امام علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب علیھم السلام کو اپنی وفات 94 ھجری تک جن چیلنجز کا سامنا رہا ان سب کا مرکزی تعلق آپ کے دادا امام علی ابن ابی طالب ، آپ کے تایا امام حسن اور آپ کے والد امام حسین علھیم السلام کے سیاسی بیانیے اور ان کی خاص طور پر تیسرے خلیفہ کی شہادت کے بعد کی جملہ سیاست سے تھا۔ بنوامیہ نے جبر کا ایک ایسا سسٹم نافذ کیا تھا جس کے ہوتے ہوئے امام سجاد یا ان کے حامیوں کے لیے سیاست پر براہ راست بات کرنا ہی مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگیا تھا۔ اور دیکھا جائے تو بنوامیہ نے اسلام کے نظریہ سیاست میں اولی الامر کا جو کردار تھا اس مکمل طور پر بدل ڈالا تھا۔ امام حسن نے خلافت سے دست برداری کے وقت جن شرائط کو معاہدے کا حصّہ بنایا تھا ان کی کھلی خلاف ورزی ہوئی اور یزید کی بزور طاقت اور دھونس و لالچ کے زریعے سے ولی عہدی اور جانشینی کے بعد اس کا

اقتدار پہ قابض ہونا اس بات کی نشانی تھا کہ اب اولی الامر سے مراد برسر اقتدار خاندان ہوگا اور اس کی فوجی طاقت ہی اس کے اقتدار اور حکومت کا جواز ہوگی ۔ طاقت کو جواز بناکر آل زبیر، آل معاویہ اور آل مروان بلاد اسلامیہ پر قابض ہوئے اور آل معاویہ سے حکومت آل مروان کے پاس آگئی ۔

سیاست میں جس بیانیہ کی امیر شام نے تشکیل کی تھی اسی بیانیے کو آل مروان نے حرز جاں بنایا اور عوام الناس کو اسے قبول کرنے پہ مجبور کیا اور جس نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اس کی قسمت قید، کوڑے اور گردن زدنی ٹھہری۔ بنوامیہ امام علی کو دو خلفاء راشدین کا باغی اور تیسرے خلیفہ راشد کا قاتل بناکر پیش کرتے تھے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کو بھی اسی راستے پر گامزن بتلاتے تھے۔ بعد میں اہلسنت کے نام سے خود کو پیش کرنے والے فقہا،محدثین اور متکلمین کی اکثریت نے فضیلت اور قرابت کے باب میں بنوامیہ کا ڈسکورس قبول کرلیا اور انھوں نے اس ڈسکورس کے تحت بنائے گئے بنوامیہ کے کلامیہ میں امام علی علیہ السلام کو تیسرے خلیفہ کے قتل کی ذمہ داری سے تو بری کردیا اور انھوں نے امیر شام کے اس بیان کو بھی رد کردیا جو امام علی علیہ السلام کو دو خلفاء سے حسد کرنے کا الزام دیتا تھا۔ لیکن فضیلت کے باب میں انھوں نے ترتیب خلافت کو ہی بنیاد بنایا اور چوتھے خلیفہ کو تین خلفاء کے بعد صحابہ اور امت سے افضل قرار دیا ۔ یہ بنوامیہ کی قائم کردہ ترتیب سے مطابقت تھی جس میں انہوں نے چوتھے خلیفہ کو بھی شامل کرلیا۔ متاخرین اہل سنت میں ہمیں بہت تھوڑی تعداد میں ایسے عالم ملتے ہیں جنھوں نے خود امام علی ابن ابی طالب کے ڈسکورس کو اپنایا ہو۔ جنھوں نے اس ڈسکورس کو اپناتے ہوئے اپنے اجتہاد کو کام میں لاکر علی ابن ابی طالب کو سب صحابہ کرام سے افضل قرار دیا ان کو بھی رافضی اور شیعہ ہونے کا الزام سہن کرنا پڑا۔

بنوامیہ نے امام علی بن حسین کے قائم کردہ مدرسے کے کئی ایک ممتاز شاگردوں کو مال اور مناصب کی لالچ اور ساتھ ساتھ جبر کی طاقتور مشینری کے خوف کے ساتھ خریدا۔ اس کی ایک بڑی مثال مُحمَّد بن مسلم شہاب زھری کی ہے جن کی تیسرے خلیفے کی شہادت کے بعد انعقاد خلافت سے لیکر واقعہ طف اور اس کے بعد کے واقعات بارے روایات بنوامیہ کے حق میں جاتی ہیں۔ بنوامیہ نے مسجد نبوی میں امام علی بن حسین کے مدمقابل مدارس کی تشکیل میں مدد دی جنھوں نے اس کے سیاسی بیانیہ کو پروان چڑھایا۔

امام علی بن حسین اپنے زمانے کے سارے آشوب سے واقف تھے انہوں نے براہ راست سیاسی معاملات پر کلام کرنے کی بجائے دعاؤں اور مناجات کو ان باتوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اس طرح سے بنوامیہ کے جرائم کو بے نقاب کیا۔ اور اپنے دادا اور اپنے تایا و والد کی طرح شہادت کا جام نوش کیا۔